بسم الله الرحمن الرحیم

شعور اتحاد

سال چہارم ۞ شمارہ (۱۵) ۞ ربیع الثانی، جمادی الاول، جمادی الثانی ۱۴۳۲ھ ۞ اپریل، مئی، جون ۲۰۱۱ء

پیشکش: مجمع جہانی تقریب مذاہب اسلامی

نگران اعلیٰ: آیۃ اللہ محمد علی تسخیری

مدیر مسؤل: علی اصغر اوحدی

علمی گروہ کی زیر نگرانی

چیف ایڈیٹر: سید احتشام عباس زیدی

سہ ماہی ''شعور اتحاد'' مسلمانوں کے درمیان اتحاد کو مستحکم بنانے نیز عالم اسلام کو فقہی، حقوقی، کلامی، فلسفی، تاریخی و... میدانوں میں درپیش مشکلات اور دشواریوں کے حل کے لئے نئی راہیں کھولتا ہے۔

یہ مجلّہ مذکورہ بالا اغراض و مقاصد کے متعلق لکھے جانے والے علمی مقالوں کا استقبال کرتا ہے۔

یہ مجلّہ مقالات کی ایڈیٹنگ اور تلخیص میں آزاد ہوگا۔

مجلّہ کے مطالب نقل کئے جاسکتے ہیں لیکن حوالہ ضروری ہے۔

ایڈریس: تہران، خیابان آیۃ اللہ طالقانی، شمارہ ۳۵۷ ''مجمع جہانی تقریب مذاہب اسلامی'' معاونت فرہنگی و پژوہشی

ٹیلی فون: ۳-۸۸۳۲۱۴۱۱-۸۸۸۲۲۵۳۲ فیکس: ۸۸۳۲۱۴۱۴-۸۸۳۲۱۶۱۶-۰۰۹۸-۲۱

قم: خیابان ساحلی، نبش لواسانی ۱۷، پلاک ۱۶۱ رکوڈ پوسٹ ۳۷۱۶۶۳۶۵۷ رٹیلی فون ۶/۷۷۵۵۴۶۴-۷۷۵۵۴۴۵-۰۰۹۸-۲۵۱

ای میل andisheh@taqhrib.org

قیمت فی مجلّہ		سالانہ
ہندوستان ۱۰۰/ روپے	.....	۴۰۰، روپے
پاکستان ۱۵۰/ روپے	.....	۶۰۰، روپے
یورپی ممالک ۵، ڈالر	.....	۲۰ ڈالر

فہرست

ریت کے محلوں میں زلزلہ کے آثار ..... اداریہ ۵

فکر و شعور

اسلامی تحریکوں کے بعض منفی پہلوؤں کا جائزہ ..... آیۃ اللہ محمد علی تسخیری ۱۳

عالم اسلام میں تقریب مذاہب اور ..... ہیئت تحریریہ ۲۵

صلح اور باہمی زندگی کی تہذیب ..... بسام الصباغ ۴۷

اسلامی نظام قضاوت پر ایک تحقیقی نظر ..... جواد حیدر ہاشمی ۶۱

سیرت نبوی میں رفق و مدارا کے انداز (۲) ..... محمد جواد اصغری ۸۹

عبداللہ بن سبا کی حقیقت، ایک تحقیقی جائزہ ..... سجاد علی استوری ۱۱۱

اقبال کی نظر میں مسلمانوں کے مسائل ..... سید معراج مہدی رضوی ۱۲۳

اتحاد کے علمبر دار

عبدالرحمٰن کواکبی، مصلح و مجاہد عالم ..... عزالدین رضا نژاد ۱۴۳

عالم اسلام کا تعارف

بحرین عہد قدیم سے اب تک ..... سید نجیب الحسن زیدی ۱۵۳

ایک کتاب : خلاصہ و تبصرہ

کتاب ''جمہوریت کا انجام'' کا تعارف و تبصرہ ..... مرتضی شیرودی ۱۸۳

اداریہ

ریت کے محلوں میں زلزلہ کے آثار

مشرق وسطا کے تیزی سے بدلتے ہوئے حالات نے ہر روز ایک نئی صورت اختیار کرنا شروع کردی ہے۔حکومتوں کے خلاف قوموں کی بیداری نے ان حکومتوں کے لئے عجیب بحرانی رخ اختیار کرلیا ہے۔گزشتہ صدی میں برپا ہونے والے بڑے بڑے انقلابات کی روح اقتصادی وسماجی مسائل ہوا کرتے تھے لیکن آج سے تینتیس سال پہلے ایران کی سرزمین پر رونما ہونے والے روحانی واسلامی انقلاب نے مشرق میں ایک نئے دور کا آغاز کیا۔

مغربی استعمار نے دوصدیوں پہلے سے جس مشرق کو اپنی تاخت وتاز کا نشانہ بنارکھا تھا مسلمان طاقتوں کو ٹکڑوں میں تقسیم کر کے اپنا غلام واسیر بنالیا تھا اور اس علاقے کے تمام دفینے،معدنیات اور تیل کے زخائر پر قبضہ کر رکھا تھا۔اس علاقے کی قوموں کی تحقیر اور ان کا استیصال کر رکھا تھا۔''لڑاؤ اور حکومت کرو'' کے منصوبے پر دوصدی سے آج تک عمل کرتے ہوئے اپنی بالادستی کا بگل بجاتا رہا تھا اور مشرق بعید سے لیکر افریقہ تک اپنی یکہ تازی کا رقص کرتا آیا تھا۔اچانک تاریخ نے اپنا رخ بدلا اور ایک بے جگر۔نڈر،شجاع اور دلیر عالم دین کی قیادت میں آنے والے اسلامی انقلاب نے مغرب کے سارے محاسبات درہم و برہم کردئے۔اس انقلاب سے پہلے اگرچہ امریکی استعمار کو مشرق وسطا کی تمام مسلمان حکومتیں سلامی دیا کرتی تھیں،مشرق کی تمام دبی کچلی قومیں مغرب اور خاص طور

سے امریکہ کو جنت ارضی تصور کرتی تھیں اور خود کو مغربیوں کا بے دام غلام سمجھتی تھیں۔ یہ وہی تاریخی سنت ہے جو فرعون کے دور میں نظر آتی تھی جس کا ذکر قرآن نے یوں کیا ہے " فاستخفّ قومه فاطاعوه" (زخرف/۵۴) اس نے اپنی قوم کی تحقیر کی تو ان لوگوں نے اس کی اطاعت کر لی، لیکن ان ممالک کے درمیان امریکہ کو ایران کی حکومت ہی ایسی نظر آئی جس کا بادشاہ بھی آنکھیں بند کر کے اس کی غلامی پر آمادہ تھا اور اپنے تخت کی حفاظت اور آقا کی اطاعت میں اپنے عوام اور اپنی قوم کو بھی نابود کرنے سے دریغ نہیں کرتا تھا یہی وجہ تھی کہ امریکہ نے اسے مشرق میں اپنا ''تھانہ دار'' بنا رکھا تھا۔ انقلاب کی کامیابی نے ایک طرف مغرب کی تسلط پسند سیاست کے تار و پود بکھیر دئے بلکہ ایرانی قوم کو اللہ، اسلام اور قرآن کے نام پر بیداری عطا کر دی۔ عوام ہوش میں آ گئے اور انھوں نے اپنی تقدیر کا فیصلہ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔

ایران کے اسلامی انقلاب نے پہلی بار مغربی استعمار کو بہت بڑا جھٹکا دیا، طاقت کے نشے میں چور استعمار نے اس نوخیز انقلاب کو کچل دینا چاہا لیکن ہر روز کی جارحیت، بربریت اور دہشت گردی نے اسلامی انقلاب کی جڑوں کو مضبوط ہی کیا اور آخر کار استعمار کی طرف سے تھوپی گئی آٹھ سالہ جنگ اور اقتصادی و سیاسی پابندیوں نے اسے گویا سختیوں کی بھٹی میں تپا کر کندن بنا دیا۔

اسلامی جمہوری انقلاب سے مایوس ہو کر امریکی استعمار نے علاقے کے دوسرے بڑے ملک اور تیل کی بڑی طاقت سعودی عرب کو جو پہلے سے اس کا حلیف تھا علاقے پر تسلط کے لئے اپنی آرزوؤں کا مرکز بنایا۔ سعودی عرب کے موروثی بادشاہی نظام اور ساتھ میں دو صدی پہلے عالم اسلام میں وجود میں آنے والے نئے وہابی مسلک نے باہم مل کر ایک نیا سیاسی اور حکومتی نظام قائم کیا ہے وہابی ملاؤں نے حکومت کے پٹرو ڈالر کے ذریعہ عالمی استعمار کے ایما پر چند کارنامے انجام دیئے:

۱) عالم اسلام میں تفرقہ اور اختلاف کا بازار گرم کرنا۔ اس کے لئے سب سے پہلے انہوں نے وہابیت کو وسیع پیمانے پر دنیا میں پھیلایا پھر اپنے علاوہ عالم اسلام کے تمام فرقوں کو باطل قرار دیتے ہوئے ان میں دشمنی کی فضا قائم کی جس کا سلسلہ آج بھی جاری ہے۔

۲) پٹرو ڈالر کے زور پر پاکستان اور افغانستان کی سرحدوں کے مابین ہزاروں ایسے مدرسوں کی تشکیل جس میں اپنے علاوہ تمام امت مسلمہ کے خلاف مسموم تعلیم کے ساتھ زہریلی ذہن سازی اور فوجی تربیت بھی شامل تھی جس کے نتیجہ میں طالبان، القاعدہ، لشکر طیبہ، لشکر جھنگوی اور اس جیسے دسیوں دہشت گرد اور انسان کش گروہ وجود میں آئے جنھوں نے گذشتہ چند برسوں میں لاکھوں بے گناہوں کا قتل عام کیا، اس دہشت گردی اور آدم کشی کا سلسلہ آج بھی روز افزوں جاری ہے جس نے کئی مسلمان ملکوں کے چہرے بگاڑ کر رکھدئے ہیں۔

۳) عالمی استعمار نے ان مسلمان نما دہشت گردوں کے عقائد ونظریات اور خون آشام اعمال وکردار کی خوب پبلیسٹی کی اور اسی کو حقیقی اسلام کا چہرہ بتا کر پوری دنیا کو اسلام سے متنفر کرنے کی کوشش کی، قرآن کو دہشت گردی رائج کرنے والی کتاب اور رسول رحمت کو ظالم ودہشت گرد بتایا، نتیجہ میں نہ جانے کتنے مسلمان مارے گئے، اجاڑے گئے اور قید ہوئے۔ اس طرح اس نے اسلام کی اس لازوال روح سے دنیا کو دور کرنا چاہا جس نے ایران میں کامیابی سے ہمکنار اور ہزاروں مشکلات کے باوجود ترقی کی راہ پر گامزن ہوکر استعمار سے اپنا لوہا منوایا ہے۔ بانی انقلاب امام خمینیؒ نے اسی لئے اس دنیا میں موجود اسلام کو دو نمایاں تصویروں میں مشخص کیا ہے:

الف) ایک اسلام وہ ہے جو عالمی استکبار واستعمار کا نوکر ہے، اس کا ہم نوا ہے اور علاقے میں امریکی و اسرائیلی مفادات کا محافظ ہے۔ آج اس کے نمونے واضح طور سے سعودی عرب اور خلیجی ممالک میں نظر آتے ہیں جس کی تازہ ترین مثال یہ ہے کہ عرب لیگ کے جدید جنرل سکریٹری نے ابھی حال ہی میں عرب دنیا کی موجودہ بحرانی صورت حال کے درمیان کہ جس میں علاقہ کی قومیں عرب سربراہوں کے خلاف اٹھ کھڑی ہوئی ہیں، حکام کے تخت لرز رہے ہیں، اور خود اسرائیل پر زوال کے بادل منڈلا رہے ہیں، یہ بیان دیا ہے کہ اب وقت آگیا ہے کہ: ''عرب ملکوں کو اسرائیل سے دوستی کا ہاتھ ملا لینا چاہیئے''۔ یہی امریکی اسلام ہے جسے اللہ کی حاکمیت کے بجائے امریکی استعمار کی بالادستی قبول ہے۔

ب) اس کے برخلاف وہ حقیقی اسلام ہے جو اللہ کے سوا کسی کی حاکمیت قبول نہیں کرتا اور مشرقی ومغربی طاقتوں کے سامنے سر نہیں جھکاتا، جو انسانوں کو پستی کے بجائے سربلندی عطا کرتا ہے اور دنیا میں دبی کچلی قوموں کو

زمین کی وراثت اور قوموں کی امامت عطا کرتا ہے: ﴿ و نرُید ُ انّ منّ علی الّذین استضعفوا فی الارض و نجعلھم ائمۃً و نجعلھم الوارثین ﴾ (قصص/۵)

ابھی ایران کے اسلامی انقلاب نے تینتیس بہاریں ہی دیکھی تھیں کہ علاقے میں موجود استبدادی حکومتوں کے پنجوں میں دبی سسکتی قوموں نے اس حقیقی اسلام سے الہام لیتے ہوئے بیدار ہونے کا عمل شروع کیا اور لا الہ الا اللہ اور تکبیر کی صداؤں سے دیکھتے ہی دیکھتے تیونس، مصر، اردن، لیبیا، یمن، بحرین، اور خود سعودی عرب کی فضائیں گونجنے لگیں اور ارباب اقتدار کے تخت وتاج لرزنے لگے۔ دیکھتے ہی دیکھتے عالمی استعمار کے پٹھو ایک ایک کر کے تخت وتاج سے محروم ہوتے گئے۔

سب سے پہلے اسلامی انقلاب کی طوفاں خیز موجوں نے تیونس کے زین العابدین بن علی کو تخت سے اتار پھینکا پھر مصر کا فرعون وقت حسنی مبارک اپنی نامبارک گھڑیاں گنتا ہوا تخت سے اترا، یمن کے علی عبداللہ صالح کی گدی چھنی اور لیبیا و بحرین کے انقلابات اپنی کامیابی کی آخری منزلوں سے قریب ہیں۔ اردن اور سعودی عرب سمیت دیگر ممالک میں بھی انقلاب کی چنگاریاں بھڑک رہی ہیں۔

امریکی اسلام کے سب سے بڑے مرکز کی موجودہ صورت حال یہ ہے کہ مسلمان قوموں کے منفور مختلف حکام اپنے ملکوں سے فرار ہو کر وہیں پناہ لے رہے ہیں جس نے مسلمان قوموں کے درمیان سعودی حکومت کے چہرے کو پوری طرح نمایاں کر دیا ہے۔ دنیا میں خود کو خادم حرمین شریفین کہلانے والے عرب حکام اب نہ صرف اپنی محبوبیت کھو چکے ہیں بلکہ انھوں نے یہ ظاہر کر دیا ہے کہ ان کی نظر میں حرمین شریفین سے محبوب خود ان کا تخت وتاج ہے۔ آج جب ریت پر بنے ہوئے ان کے محلوں میں زلزلہ کے آثار نمایاں ہو رہے ہیں تو انھوں نے اللہ کی قدرت و طاقت کے بجائے استعماری طاقتوں پر بھروسہ شروع کر دیا ہے۔

۱) آج سعودی عرب اپنی اپنی قوموں سے بھاگے ہوئے استعمار کے پٹھو حکام کی پناہگاہ بنا ہے۔

۲) آج اس خوف سے کہ بحرین کا انقلاب کہیں سعودی عرب کو بھی اپنی لپیٹ میں نہ لے لے امریکہ کی حلیف بحرینی حکومت کو بچانے کے لئے اس نے اپنی فوجیں اس ملک میں اتار کر وہاں کے عوام کا قتل عام کیا ہے

کیوں کہ بحرین امریکی بحریہ کا ایک بڑا مرکز ہے۔

۳) سعودی عرب، عراق کی عوامی حکومت کو کمزور کرنے اور وہاں کے مظلوم عوام کا قتل عام کرنے کے لئے دہشت گردوں کے گروہوں کو روز نئے اسلحے اور فوجی تربیت دے کر عراق میں دھماکے کراتا ہے۔

۴) علاقے کی مختلف استبدادی حکومتوں کے زوال اور عوام کی انقلابی کامیابیوں پر پردہ ڈالنے کے لئے سعودی عرب شام کی پرامن حکومت کے علاقوں میں اس لئے دہشت گردی کا بازار گرم کئے ہوے ہے کہ کم از کم علاقے کی مسلمان قوموں اور ملتوں کی انقلابی کامیابیوں پر کچھ پردہ ڈال سکے۔

۵) کون نہیں جانتا کہ اسرائیل اور حزب اللہ لبنان کے درمیان تینتیس دن کی جنگ میں سعودی عرب نے اسرائیل کو جنگی طیاروں کے لئے تیل فراہم کیا تھا۔

۶) فلسطین کی غزہ پٹی میں اسرائیل نے پندرہ لاکھ سے زیادہ مسلمان بوڑھوں، جوانوں اور بچوں کو پوری دنیا سے کاٹ کر گذشتہ پانچ برسوں سے اس طرح قید کر رکھا ہے کہ حتی کھانے پینے کی اشیاء تک وہاں آسانی سے پہنچ نہیں پاتیں اور خادمین حرمین شریفین کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی۔

یہ بات پوری طرح واضح ہو چکی ہے کہ عالمی استکبار دہشت گردی کے خاتمے کے نام پر اس وقت پورے عالم اسلام سے نبرد آزما ہے اور اس مہم میں علاقے میں اس کا سب سے بڑا حلیف وحمایتی یہی سعودی عرب ہے، لیکن جب سے علاقے میں مسلمان قومیں اور ملتیں بیدار ہوئی ہیں نہ صرف سعودی حکام کی راتوں کی نیندیں اڑی ہوئی ہیں بلکہ ان کے آقا امریکہ اور اسرائیل بھی پریشان ہیں۔

سعودی حکام نے اس وقت اس طوفان سے مقابلے کے لئے دو اسلحوں سے کام لینا شروع کیا ہے یعنی مال اور دین دونوں کو برابر سے استعمال کر رہے ہیں۔ عرب دنیا میں برپا ہونے والے انقلابات جن کی روح اسلامی نظر آتی ہے، کو روکنے کے لئے وہابی مفتیوں نے فتوؤں کا بازار گرم کر رکھا ہے اور تیونس، مصر، یمن، اور دوسرے مقامات پہ ان انقلابات کے خلاف فتوے صادر کر رہے ہیں دوسری طرف سعودی بادشاہوں نے پیسوں کی تھیلیاں کھول دی ہیں۔ شاہ عبداللہ نے عوام کو منانے کے لئے ایک سو انتیس عرب ڈالر کی بڑی رقم مخصوص کی ہے۔ یہ رقم ان

کے پچھلے سال کی آمدنی کا نصف حصہ ہے اسی طرح انھوں نے عوام کو قابو میں رکھنے کے لئے پانچ لاکھ مکانات بنا کر سستی قیمت پر عوام کے حوالے کئے ہیں۔ان سب کے باوجود اب یہ طے نظر آرہا ہے کہ سعودی عرب کی خاندانی حکومت زیادہ دیر قائم نہ رہ پائے گی اس لئے کہ ان کا اعتماد اللہ کی ذات پر نہیں ہے اور وہ اب زیادہ دیر تک ان علاقائی تغیرات سے اپنے کو بچا نہیں سکتے۔لیکن سوال یہ ہے کہ سعودی عرب میں یہ تغیر کیسا ہوگا اور کب وجود میں آئے گا؟ ۔

فکر و شعور

اسلامی تحریکوں کے بعض منفی پہلوؤں کا جائزہ

آیۃ اللہ محمد علی تسخیری
ترجمہ: سید محمد جواد عسکری (رسرچ اسکالر دانشگاہ تہران)

خلاصہ:

اسلامی تحریکوں کے بڑھتے ہوئے قدم کو مدنظر رکھتے ہوئے، ہمیں اسلامی تحریکوں کے بعض منفی پہلووں پر بھی دھیان دینا ہوگا تا کہ اس تحریک کے بلند بالا اور اہم مقاصد تک پہنچنے کا راستہ ہموار ہو اور اس میں موجود مشکلوں کو برطرف کیا جا سکے۔ اس مضمون کے ذیل میں اسلامی تحریکوں میں موجود منفی پہلوؤں کا کچھ اس طرح ذکر کیا گیا ہے: اسلامی شریعت کے بعض حصوں کو عملی جامہ نہ پہنانا، اسلامی شریعت کو سمجھنے میں سطحی نظری اور کوتاہ بینی، علماء، دانشور اور صحیح اجتہاد سے دوری، اسلامی جدیدیت کے نام پر مغرب کے بعض نظریات کی پیروی، ٹرورزم اور تشدد کی طرف جھکاو، تنظیمی مصلحت پسندی اور منصوبہ بند جرم پسندی کی طرف جھکاو، کاہلی اور مایوسی، جزئیات کی اصلاح پر توجہ اور بنیادی تغییرات کی طرف عدم توجہ، امت کے ادبی اور تہذیبی امکانات سے فائدہ نہ اٹھانا، حقایق سے دوری اور تدریجی ترقی کی طرف توجہ نہ دینا، فرقہ پسندی، خود پسندی اور دوسروں سے قطع رابطہ، علاقائیت کی طرف جھکاؤ، دور اندیش اور عملی

منصوبوں کا فقدان، ایک دوسرے پر الزام تراشی اور تفرقہ، خالی اوقات میں اسلامی امور کی طرف توجہ۔

کلیدی الفاظ:

اسلامی تحریک، منفی روشیں، امت، شریعت، تنظیم، فرقہ پسندی

مشکوک کوششوں کے باوجود، اسلامی تحریک ایک واضح حقیقت کے طور پر ابھری ہے جو امت اسلامی کے مستقبل کی تشکیل اور اس کی سیاسی اور سماجی ترقی پر اثر انداز ہوئی ہے جس کے نتیجہ میں اسلامی قوانین کی طرف توجہ اور امت اسلامیہ کے مشکلات کے حل وفصل کے لئے شریعت کو مدنظر رکھنے اور اسلامی شریعت کو نافذ کرنے کے حالات پیدا ہوئے ہیں۔ چنانچہ آج ہم اسلامی قوانین کے پیرو ایسے لوگوں کو دیکھ سکتے ہیں جو ان عناصر کے سامنے کھڑے ہوئے ہیں جو عام مسلمانوں کے ذوق وذہن کے خلاف بعض چیزوں کو سماج میں عام کررہے ہیں، اور اسی وجہ سے غربی سوچ رکھنے والے اور غربی تہذیب کی پیروی کرنے والے تمام تر کوششوں کے باوجود سماج میں اپنا اثر نہیں چھوڑ سکے ہیں۔

مشہور دانشور، ڈاکٹر کلیم صدیقی اس بارے میں فرماتے ہیں: تاریخ نئے دور میں داخل ہوچکی ہے، پسماندگی اور جہالت کا دور ختم ہو چکا ہے اور ایک نیا دور درک وفہم اور ترقی کا ہم لوگوں کے درمیان شروع ہو چکا ہے۔ (اداریہ کنڈین نیوز پیپر ''کرسنٹ'' ۱۵ اگست ۱۹۸۰) اسلامی تحریک نے چند سالوں میں بہت تیزی سے ترقی کی ہے اور یورپ اپنے تمام تر دبدبہ اور قوت کے باوجود اور اپنے اکثر سیاستدانوں، نظریہ پردازوں، دانشوروں اور مورخوں کے اعترافات کو مدنظر رکھتے ہوئے مایوسی اور پریشانی سے دوچار ہے۔ ان لوگوں نے عالم اسلام میں بڑھتی ہوئی بیداری اور اس کے اثرات سے ہونے والی اسلامی سماجی وثقافتی تبدیلی جو کہ مغربی تہذیب کی بالادستی کو کمرنگ کررہی ہے، کے بارے میں دنیا کو متنبہ کیا ہے۔

بعض مغربی قلم کاروں نے مسلمانوں میں یورپی طاقت کے سامنے کمزوری کا احساس دلانے کی کوشش کی ہے اور ان کو مصالحت کرنے کی صلاح دی ہے۔ اس ضمن میں، محترمہ ''شیرین ہانٹر'' اپنے مضمون مستقبل میں اسلام اور یورپ کے روابط میں لکھتی ہیں: ایک یورپ مخالف اقتصادی اور سیاسی طاقت کے پیدا ہونے کے آثار تقویت پا

رہے ہیں،اور یہ طاقت اسلامی ممالک کے لئے اہم حلیف اور مالی اعتبار سے انکے لئے مددگار ثابت ہوسکتی ہے اور اسلامی ممالک کو یورپ کے مقابلہ کھڑے ہونے کے لئے اکسا سکتی ہے۔مغرب کے مقابلہ میں ان کی رقابت کو تقویت دے سکتی ہے اور انھیں مغربی سیاستوں کے مشکلات کے مقابل تشویق کرسکتی ہے۔اس کے برعکس اس طاقت کے نہ ہونے پر اسلامی ممالک کے رویہ میں نرمی آسکتی ہے۔(مستقبل الاسلام والغرب،ص ۲۲۵) ان محترمہ نے اپنی کتاب میں مسلمانوں کو تسامح کی طرف ترغیب دی ہے اور انہیں یورپ سے مقابلہ نہ کرنے کی جانب توجہ دلائی ہے۔

اسلامی تحریک کے منفی اثرات

اس سلسلہ میں جس موضوع پر سب زیادہ دھیان دینے کی ضرورت ہے وہ ایسے بہت سے منفی اثرات ہیں کہ اسلامی تحریک اور جو گروہ اس کی نمائندگی کرتے ہیں اپنے بعض کاموں میں ان کے شکار ہیں۔امید ہے ان مسائل کے بیان کرنے کے سبب ان خطرات کی طرف زیادہ سے زیادہ توجہ مرکوز کی جائے اور ان سے چھٹکارہ پانے کے لئے کوئی تدبیر کی جاسکے جو آیندہ ہونے والی ترقی وکامیابی کی راہ میں معاون ثابت ہوسکے۔اسی ذیل میں یہاں بعض منفی اثرات کی جانب اشارہ کیا جاتا ہے:

۱)شریعت کے بعض قوانین کا نفاذ اور بعض سے روگردانی

اس طرح کے عمل سے کبھی بھی خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں ہوسکتی ہے۔ضرورت اس بات کی ہے کہ باقی قوانین شریعت کی طرف بھی توجہ کی جائے،اور یہ کام اس فکر کی نشاندہی کرتا ہے کہ اسلام،نظام زندگی اور انسانی خواہشات کا ایک مکمل مجموعہ ہے جس میں ہر عمل ایک دوسرے سے وابستہ ہے جو ایک معتدل زندگی کے لئے سب سے اہم ہے۔

اس منفی پہلو کو واضح کرنے کے لئے بہترین مثال یہ ہے کہ سماج میں انسانی زندگی کے خواہشات اور سماجی واقتصادی ضرورتوں اور آزادی وعدالت کو مدنظر نہ رکھ کر احکام تعزیرات کو نافذ کیا جائے۔

۲)اسلامی شریعت کو سمجھنے میں سطحیت اور تنگ نظری

اس میں کوئی دورائے نہیں ہے کہ اسلامی قوانین کو سمجھنے میں سطحیت اور تنگ نظری نے سماج میں مشکلوں کو

نہ صرف حل نہیں کیا ہے بلکہ اسکی پیچیدگیوں میں اور اضافہ کیا۔ اور مسلمانوں کو اپنی زندگی کی مشکلات کو اسلامی قوانین کی رو سے حل کرنے سے محروم کیا ہے اور دشمنوں کو موقع فراہم کیا ہے کہ وہ اسلام پر پسماندہ ہونے اور جمود و تنگ نظری کا الزام لگائیں۔ افغانستان میں طالبان کے دور حکومت میں اس طرح کے مشکلات کا تجربہ دیکھا جا سکتا ہے۔

۳) علماء، دانشور اور صحیح اجتہاد سے دوری

یہ امر ناقص اجتہاد کا سبب بنتا ہے اور بعض اوقات حساس موضوعات پر خودسرانہ اور ناقص اجتہاد کی وجہ سے غلط فتاویٰ کا جاری ہونا ہے جو کہ بسا اوقات اصل شریعت اور اس کے اہداف کے مغایر ہوتے ہیں۔ یہ موضوع بعض جوشیلے مسلمان جوانوں کی تحریک میں جو اصلی اسلام سے بے خبر ہیں دیکھا جا سکتا ہے۔

بعض مغربی مفکر اس امر کی طرف ترغیب دلاتے ہیں؛ مثال کے طور پر ''بیڈہام برایان'' اس بات پر تاکید کرتا ہے کہ فقہی اجتہاد صرف مجتہد حضرات تک محدود نہیں ہونا چاہئے بلکہ اسلام کے بارے میں اظہار رائے کا حق ہر کسی کو ہونا چاہئے اور علماء قوم کی ترقی میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں۔ وہ تحریک کے لیڈروں سے یہ چاہتا ہے کہ اس رکاوٹ کو پار کر جائیں۔

عجیب یہ ہے کہ جہان اسلام میں بھی ہم اس طرح کی کتاب دیکھتے ہیں جو تحریک اسلامی کے داعیوں کی جانب سے نشر ہوئی ہے جس میں اس طبقہ کی جسے ''علماء'' کا نام دیا جاتا ہے، مخالفت کی گئی ہے اور اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ اجتہاد کو سب کے لئے عام کیا جائے۔ ہر شخص اپنے حساب سے اسلام کے بارے میں رائے زنی کا حق رکھتا ہے جس سے ہر طرح کی خرافات سماج میں رواج پا رہی ہے۔ (الحوار مع الاخر، ص ۱۶۲)

بہت سی تحریکیں خلوص نیت کے ساتھ شروع ہوتی ہیں لیکن ان کے لیڈروں کی جہالت اور علماء سے دوری اختیار کرنے کے سبب ان میں انحرافات شروع ہو جاتے ہیں اور نتیجے میں اسلام مخالف حرکتیں اور کبھی کبھی شرک بھی ان میں دیکھا جا سکتا ہے۔ امریکا میں سیاہ فام امریکی مسلمانوں کی تحریک میں ''شریف دروعلی'' کا ادعائے پیغمبری، ''فاردعلی منتظر'' کا دعوائے غیبت اور ''عالیجاہ محمد کا'' ادعائے پیغمبری کالوں کی اور سفید فام مخالف تحریک اور اسی طرح کی اور تحریکوں میں اس طرح کے انحرافات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے۔ (استاد آدم بامبا کا مقالہ ''مالکوم ایکس'' حج سمینار، مکہ مکرمہ ۱۴۲۳ھ)

۴) اسلامی جدیدیت کے نام پر مغرب کے بعض انحرافی نظریات کی پیروی

یہ وہ سرنوشت ہے جس میں متعدد اسلامی ممالک کے دائیں بازو بایائیں بازو کے لوگ مبتلا ہوئے اور اس الحاد، فکری کج روی کا شکار ہوئے یعنی وہ اسلام اور لیبرالزم یا سوشلزم کو باہم ملا دیتے ہیں اور تغییر وتبدیلی کی بنیادوں کی پابندی کے بغیر ترقی اور کمال کا نعرہ بلند کرتے ہیں۔

بعض اسلامی ممالک اس کے شکار ہوئے اور کمیونیسم یا لیبراریسم کے طرف ان کا جھکاو ہوا جو ان کے الحاد کا سبب بنا الحاد کا اور ذہنی طور سے وہ لیبرالیسم اور سوشلیسم کے نعرہ لگانے والوں کے شکار ہو گئے جو بنا کسی اصول اور اساس کے تغییر اور انقلاب کا نعرہ لگاتے ہیں۔

۵) ٹرورزم اور تشدد کی طرف جھکاؤ

یہ سب سے خطرناک گمراہی ہے جس نے تمام اصول وقواعد کو بالائے طاق رکھ دیا اور اسلام پر بہتان تراشی کا سبب بنی اور اس کی وجہ سے مختلف مشکلوں نے اسلام اور اسلامی مراکز کو اپنی جکڑ میں لے لیا ہے۔

یہ رجہان جو کبھی باہری طاقتوں کا آلۂ کار اور بعض اوقات ہمارے خلاف معاندانہ اور پرتشدد ردعمل کے صورت میں سامنے آتا ہے، کسی بھی حال میں اسلام میں نظام جہاد کی تعریف بیان نہیں کرسکتا ہے۔ دشمن اپنے تمام وسائل کے ساتھ اس کوشش میں ہے کہ اس خالص نظام سے اس کے تعلیمات کے اہم اصول اور اس کے ضروریات کو ہمارے نظام تعلیم اور سیاست وسماج سے نکال دے۔ اسلام، بڑے پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیاروں کے استعمال کی ہر صورت میں خواہ وہ فردی ہو اور خواہ کسی ملک کی طرف سے ہو، مخالفت کرتا ہے۔

امریکہ جو خود کو دہشت گردی کے خلاف جنگ کا بانی سمجھتا ہے، خود دنیا میں متعدد دہشت گرد جماعتوں کی سربراہی کرتا ہے اور مخصوصاً صہیونی دہشت گردی کو مالی مدد فراہم کرتا ہے، اس طرح سے وہ یورپین دانشوروں کے بقول دنیا میں اپنی درندگی اور وحشیانہ حکومت کو سیاسی، اقتصادی اور سماجی طور سے استعمال کرنا چاہتا ہے اور اس راہ میں وہ کسی بھی بین الاقوامی قانون کی پرواہ کئے بغیر خطرناک اور مہلک نظریات پیش کرتا ہے جیسے ''بچاو کی جنگ'' اور یہ نظریہ کہ ''یا تم ہمارے ہمنوا ہو یا پھر دہشت گرد'' ہو....

۶) تنظیمی اور منصوبہ بند مصلحت پسندی کی طرف جھکاؤ

یہ رجحان ممکن ہے ایک ایسے ماحول میں زیادہ قابل فہم ہو جہاں لیبرل اور مادی سوچ حاکم ہے، لیکن اسلامی منطق جو نہ صرف یہ کہ مختلف جماعت اور ان کے مختلف طرز عمل اور ہر ایک کے مستقل اقدام کی مخالفت نہیں کرتی ہے بلکہ خود اس کی حمایت کرتی ہے، وہ ہرگز اس رجحان کی حمایت نہیں کرتی ہے۔ اسلام اس بات کو مطلقاً قبول نہیں کرتا ہے کہ جماعت یا تنظیم ایک ایسی فولادی چار دیواری کی شکل اختیار کر لے جس میں لوگوں سے سوچنے، پرکھنے اور حق اعتراض کو سلب کر لیا جائے اور لوگوں کو اپنے لیڈروں کی بے چون و چرا اطاعت پر مجبور ہونا پڑے۔

اسلامی مکتب فکر میں اکثر مقامات پر اس بات کی نفی کی گئی ہے، جیسے اس آیہ مبارکہ کی تفسیر میں ہے'' اتخذوا احبارهم و رهبانهم اربابا من دون الله ''ان لوگوں نے اپنے خدا کو چھوڑ کر اپنے عالموں اور زاہدوں کی پیروی شروع کر دی۔ (توبہ/۳۱) یہ آیت اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ وہ لوگ بلا کسی قید اور شرط کے اپنے رہنماوں کی پیروی کرتے ہیں۔

۷) مایوسی اور کاہلی

دشمنوں کی اذیت ناک خبریں، مختلف قسم کے محاصرے اور طرح طرح کی ظالمانہ پابندیاں جو اسلام و امت اسلامی پر مسلط کی جاتی ہیں نیز مشکلات کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنا اور ان کوششوں کو مشکوک بنانا جن کے سبب ان دشواریوں پر کامیابی حاصل ہوتی ہے، یہ سب سماج میں مایوسی اور ناامیدی کی فضا قائم کرتی ہیں اور سبب بنتی ہیں کہ انسان کاہل ہو جائے بڑے مقاصد کو بھول جائے، یہاں تک کے چھوٹے ہدف کے حصول پر اکتفا اور بہت ہی معمولی مقصد کی حصولیابی اس کے لئے کافی ہوتی ہے۔ افسوس ہے ان لوگوں کے لئے جو اپنی امیدیں چھوڑ دیتے ہیں و ذلت اور خواری کو اپناتے ہیں، جب کہ امید مومن کی خصوصیات میں سے ہے۔ خداوند باری تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:''ان تکونوا تالمون فانّهم یألمون کما تألمون و ترجون من الله ما لا یرجون '' اگر لڑائی میں تمھیں تکلیف پہنچتی ہے تو جیسی تم کو تکلیف پہنچتی ہے ان کو بھی ویسی ہی اذیّت ہوتی ہے جبکہ تم کو یہ تقویت بھی ہے کہ تم خدا سے وہ امیدیں رکھتے ہو جو انکو نصیب نہیں۔ (نساء/۱۰۴)

۸) جزئی اصلاحات پر توجہ اور بنیادی تبدیلیوں سے بے توجہی

چنانچہ فرعی مسایل کو اگر کلی ڈھانچے کے بجائے ایک کلی موضوع کے جزء طور سے دیکھا جائے تو یہ گمراہی کا

سبب بنتے ہیں اور عین ممکن ہے کہ دشمن بھی اس فکر کے پھیلنے میں مدد کرے تا کہ لوگوں کی حمایت حاصل کر سکے۔ جب کبھی بھی اصلی اور کلیدی مسائل، بھلا دیے جائیں، تو قوم کی پیشرفت اور ترقی رک جاتی ہے۔

۹) امت کے ثقافتی اور تہذیبی امکانات سے فائدہ نہ اٹھانا

عبادات کا اہم رول اور ان کا اثر خصوصاً اجتماعی عبادات، جیسے نماز جمعہ اور حج، مسلمانوں کی بنیادی تربیت کے میدانوں میں نظر انداز کر دیئے گئے ہیں۔

دو عظیم دانشور، استاد ''السریانی'' اور ''میرزا'' نے، انڈونشیا کے انقلاب پر حج کے اثرات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ ہالینڈ کے حکمراں جنھوں نے ۱۶۴۱ء سے ۱۹۴۵ء، تک اس اسلامی ملک کو اپنے قبضے میں کر رکھا تھا انہوں نے اس بات کو محسوس کیا کہ ہر سال مراسم حج کے بعد ملک کی انقلابی تحریک میں تیزی آتی ہے۔ باوجودیکہ ان دانشوروں نے اس کی علت حاجی بھائیوں کی جاوہ کے لوگوں سے ملاقات بتائی ہے، لیکن ہمارے نقطہ نظر سے، سب سے اہم بات خود حج ہے جس کی وجہ سے یہ انقلابی فکر حاجی میں پیغمبروں کے قیام اور مخصوصاً حضرت ابراہیمؑ اور پیغمبر اکرمؐ کے انقلابی عمل کے ذریعہ پیدا ہوتی ہے۔

فرانسیسی غاصب حکمراں، جنھوں نے الجزائر کو اپنے قبضہ میں کر رکھا تھا انھوں نے جب حج کے اثرات کو محسوس کیا تو اس کے ڈر سے پہلے حج کو بند کرنے کی کوشش کی اور پھر سختی سے اس کی مخالفت شروع کی۔ (استاد مولود عویمر کا مقالہ ''مکہ اور اس کے عوالم ''مالک بن نبی'' کے نقطہ نظر سے'' حج سمینار ۱۴۲۴ھ)

جو لوگ اسلامی تحریک کی بیداری اور اس کی ترقی کی راہ میں کوشش کرتے ہیں ان کو چاہئے کہ وہ کبھی بھی اسلام میں موجود ظرفیت اور اس کی قوت سے غافل نہ ہوں، بلکہ ان کو چاہئے کہ ان قوتوں کو حتی الامکان بروئے کار لائیں اور اگر ایسا نہ ہو تو دشمن اس سے غلط فائدہ اٹھا سکتا ہے۔

۱۰) حقائق اور تدریجی ترقی سے دوری

بدلاؤ ہمیشہ ایک منصوبہ بند لایحہ عمل اور کافی غور وخوص کے بعد جامۂ عمل پہنتا ہے اور کبھی بہت زیادہ پر امید ہو کر اس مرحلہ کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئے؛ کیونکہ یہ مسلسل غلطیوں اور کوتاہیوں کا سبب بنتا ہے جس کی وجہ سے وہ گروہ جو تحریک کے اصل ہدف سے پوری طرح سے واقف نہیں ہیں کنارہ کشی اختیار کر لیتے ہیں، اور بعض اسلامی

تحریکیں یہ بہانہ بنا کر کہ وہ ابھی منصوبہ بندی کر رہے ہیں اور کوئی عملی شکل اختیار نہیں کر سکتے، ہاتھ آنے والے مواقع کو تلف کر دیتے ہیں۔

۱۱) فرقہ پسندی

فرقہ پسندی ایک خطرناک بیماری ہے جس نے امت اسلامی کو سب سے زیادہ نقصان پہنچایا ہے اور اس کی وجہ سے، بہت سارے فسادات برپا ہو چکے ہیں۔ اسلام نے حقیقت پسندی، انعطاف، لچک اور اپنے مستقبل کے لئے منصوبہ بندی کی ضرورت کے تحت اور اسلامی قوانین کے تحفظ کے لئے، اجتہاد کی اجازت دی ہے اور اجتہاد نے بھی زندگی کے پیچیدگیوں کے پیش نظر تنوع اور جدیدیت کو جنم دیا ہے جس کے نتیجہ میں، متعدد مذہب رونما ہوئے ہیں جو اس امت کے سرمایہ کے طور پر دیکھے جاتے ہیں۔ (انصاری، ص ۱۵۵۔۲۲۰)

لیکن اس کے بعد یہ مذاہب، فرقوں میں تبدیل ہو گئے اور نالائق حکمرانوں کے ذاتی مفادات کے سبب ان کے درمیان اختلافات شروع ہو گئے اور آزاد اجتہاد نے ایک خطرناک اور مہلک رخ اختیار کر لیا، یہاں تک کہ کچھ لوگوں کو اس باب کو بند کرنے پر اکسایا گیا۔ اسلامی تحریکیں کبھی کسی خاص فرقہ کی جانب سے شروع نہیں ہوئی ہیں بلکہ اسلام کی روشنی میں وجود میں آئی ہیں اور اس راہ میں کافی فائدہ مند ثابت ہوئی ہیں لیکن اب ایسا لگتا ہے کہ بعض اسلامی تحریکوں میں فرقہ پسندی نے پنپنا شروع کر دیا ہے جو اس تحریک کے لئے ایک بڑا خطرہ ہے اور اس کو اپنے اصل ہدف سے دور کر سکتی ہے۔

۱۲) خود پسندی اور دوسروں سے قطع رابطہ

اسلامی تحریک کبھی بھی خلاء میں پروان نہیں چڑھتی ہے، بلکہ دوسرے عناصر بھی اس کے ساتھ ہوتے ہیں اور اسے ان عناصر سے بھی ارتباط رکھنا چاہئے۔ باوجود اس بات کے گذشتہ دہائیوں میں مختلف قسم کے عناصر جیسے دہریت، نیشنلزم اور سوشلزم وغیرہ نے اسلامی تحریکوں کی راہ میں مشکلات کھڑی کی ہیں، لیکن آج وہ اس بات کی ضرورت محسوس کر رہے ہیں کہ اسلامی تحریک کے ساتھ رہیں۔ اسلامی تحریک کو بھی چاہئے کہ انکے ساتھ بات چیت کے دروازہ کھولے۔ عین ممکن ہے کہ اس سے ان کے ساتھ مفاہمت ہو، ان کی مدد سے پسماندگی دور کی جائے اور بڑے دشمن کا سامنا کرنے میں آسانی ہو اور سب سے قطع رابطہ کرنے کی صورت میں ممکن ہے یہ طاقتیں تحریک کے

خلاف اکھٹا ہو جائیں اور تحریک کے مقاصد کو نقصان پہنچائیں۔ایک ایسی مفاہمت اور دنیا میں موجود معنوی تحریکوں اور انسانی حقوق نیز کمزوروں کے لئے کام کرنے والی تنظیموں کے درمیان رابطہ تحریک کو کافی فائدہ پہنچا سکتا ہے اور آج ہم اس طرح کی کوششوں کو دیکھ بھی سکتے ہیں۔(مثال کے طور پر بیروت میں ہونے والے اسلامی اور قومی سمینار، بیروت، قاہرہ، تہران، خارطوم اور دیگر اسلامی ممالک میں ہونے والے اسلام اور عیسائیت سے متعلق سمینار)

۱۳) علاقائیت کا رجحان

بعض اسلامی تحریکیں، زیادتر علاقائی اور محلی مفادات کو مدنظر رکھتی ہیں اور عمومی مسائل کو نظر انداز کر دیتی ہیں۔ایک خاص خطہ تک محدود ہوگئی ہیں اور دوسرے مناطق میں ہونے والے مظالم کی طرف دھیان نہیں دیتی ہیں وہ یہ بات بھول جاتی ہیں کے امت اسلامی سے الگ ہونے کی صورت میں دشمن ان پر آسانی سے غالب آسکتا ہے۔شاید جغرافیائی محدودیت بھی ایک قید و بند کی شکل اختیار کرتی ہے اس کے تحت جہان اسلام کو نقصان پہنچتا ہے۔احتیاط کی بنا پر اس موضوع کی وضاحت سے گریز کیا جاتا ہے۔

۱۴) دوراندیش اور اسٹرٹیجیکل پروگرام کا فقدان

امت اسلامی اور تیسری دنیا دوراندیش اور اسٹرٹیجیکل پروگرام کے فقدان کا شکار رہی ہے اسی لئے اس کے پاس مستقبل کے لئے کوئی ''روٹ پلان'' نہیں ہے۔واضح ہے کہ کوئی بھی بنا کسی پروگرام اور پلان کے آگے بڑھنا چاہے تو اسے شکست ہوگی اور وہ خود کو مہلک پریشانیوں کے زد میں پائے گا۔

مستقبل کو سنوارنے اور دوراندیش پروگرام بنانے کی غرض سے، آج مغربی یونیورسٹیوں میں باقاعدہ علمی مراکز موجود ہیں جو ایک اسٹرٹیجیکل نقطہ نظر فراہم کرتے ہیں۔''شیطانی آیات'' کا ہنگامہ اپنی ادبی خصوصیات کے ہمراہ، مختلف تھیوری جیسے ''تہذیبوں کا ملاپ'' اور ''تاریخ کا خاتمہ'' اپنے تاریخی نقطہ نظر کے ساتھ، ''بچاو کی جنگ'' اور بعض نشانیاں جیسے ''گلوبلایزشن'' اور کچھ اصطلاحات جیسے ''عالمی گاؤں'' اور ''جغرافیائی حدود سے عاری دنیا'' جو اقتصادی دنیا میں پیش کی گئی ہیں، یہ سب اس سے پہلے کہ بین الاقوامی سطح پر عام ہوں، پہلے اکیڈمک فرضیوں کی شکل میں پیش ہوئیں۔سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اسلامی تحریک کے پاس ان میں سے ہر ایک کے لئے کیا جواب ہے۔

۱۵)ایک دوسرے پر الزام تراشی اور تفرقہ

اس طرح کے رویوں کو مادی تحریکوں میں محسوس کیا جاسکتا ہے، لیکن اسلامی تحریکیں کبھی اس طرح کے رویہ کو قبول نہیں کرسکتی ہیں۔ کیونکہ ہدف ایک ہی ہے اور ایک دوسرے سے تسامح وصلح پسندی اور ایک دوسرے کے اجتہاد کو قبول کرنا نیز ایک دوسرے سے بھائی چارگی اور اتحاد کے جذبہ کے ساتھ ملنے کے جو اصول ہمارے درمیان ہیں کبھی ہمیں اس بات کی اجازت نہیں دیتے ہیں کہ ایک دوسرے کے ساتھ دھوکا کریں اور ایک دوسرے کے کام میں خلل پیدا کریں۔ لیکن بہت ہی افسوس کے ساتھ آج ہمارے درمیان اس طرح کے واقعات پائے جاتے ہیں، جو اسلامی تحریک کی اصل اور اس کی حیثیت کے لئے خطرناک ہیں۔

۱۶)خالی اوقات میں ہی اسلامی امور کی طرف توجہ

ہمارے بہت سے اسلامی عہدہ دار صرف خالی اوقات میں اسلامی کاموں کی طرف توجہ دیتے ہیں اور اپنا اصلی وقت شخصی کاموں اور یہاں تک کہ بعض اوقات قدیمی تنظیموں کے ساتھ صرف کرتے ہیں جنھیں وہ خود بھی نہیں مانتے ہیں۔ ایسی صورت میں، اسلامی تحریکیں بقول اسلامی دانشور کلیم صدیقی کے بدلاؤ اور ایک جانبی حیثیت کی حامل ہوجاتی ہیں (اسلامی جوانان آرگنائزیشن ریاض کے زیر اہتمام سمینار میں خطاب، ۱۹۷۶ء) جب کہ اسلامی تحریک سے وابستہ امور کو اپنے باقی امور پر اولویت دینا چاہئے۔

آخری باتیں:

۱)ممکن ہے ذکر شدہ بعض چیزیں ایک دوسرے کے اندر موجود ہوں یا کسی اور وجہ سے رونما ہوئی ہوں لیکن ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کی اہمیت کے مدنظر ان میں سے ہر ایک کا جدا جدا اور گہرائی کے ساتھ مطالعہ کیا جائے۔

۲)ان تمام منفی پہلوؤں اور مشکلات اور داخلی دقتوں کو ان ہی بیرونی مشکلات سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ در حقیقت باہر سے ہونے والی مشکلات اندرونی مشکلات سے فائدہ اٹھاتی ہیں اور ایک خطرہ کی صورت اختیار کرلیتی ہیں اور بسا اوقات داخلی مشکلیں بیرونی مشکلات کے وجود میں آنے کا سبب بنتی ہیں۔ یورپ کا کام کئی دہائیوں اور دو صدی سے مخصوصاً انیسوی اور بیسوی صدی میں قوم میں پسماندگی، انتشار اور امت کو پیچھے رکھتا رہا ہے۔

۳)ان منفی پہلوؤں اور آفتوں پر غور کرنے کے لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ اس بحث کو علیٰحدا سے بیان کیا جائے!اس بحث کے کچھ عناصر،منفی پہلوؤں کو مدنظر رکھتے ہوئے اس طرح سے بیان کئے جاسکتے ہیں:

۱)شریعت کے کامل نفاذ پر زور دینا۔

۲)شریعت اور اس کے اہداف کی مکمل جانکاری اور سطحی نگاہ سے دوری۔

۳)علماء کے کردار کو نمایاں کرنا اور علمی مراکز و آزاد اجتہاد کو رونق بخشنا۔

۴)باہر سے آنے والی تحریکوں سے آگاہ و ہوشیار رہنا۔

۵)اسلام کے پرامن چہرہ کی طرف توجہ اور تشدد و دہشت گردی کی نفی۔لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ لشکرگاہ کفر کی طرف سے دہشت گردی کے اقدامات کے مقابل خاموشی اختیار کرلی جائے۔

۶)انقلابی کاموں میں ظاہری بت پرستانہ طور طریقوں کی مخالفت۔

۷)لوگوں کے درمیان امید جگانا۔

۸)اس سلسلہ میں فردی اصلاحات کو نظرانداز کئے بنا بنیادی کاموں کی طرف دھیان دینا۔

۹)پیش آنے والی تمام فرصتوں سے بہتر طریقہ سے فائدہ اٹھانا۔

۱۰)مسائل کے روبرو حقیقت پسندانہ رویہ۔

۱۱)دوسروں سے منطقی اور عقلی رابطہ برقرار کرنا۔

۱۲)فرقہ پسندی کی مخالفت۔

۱۳)عالمی اسلامی سیاست کی حمایت۔

۱۴)دوراندیش اور بلندمدت مقاصد کے پروگراموں پر گامزن ہونا۔

۴)ممکن ہے یہ سوال اٹھایا جائے کہ:ان مطالب کا سیاستدانوں اور لیڈروں سے کوئی ربط نہیں ہے تو پھر ان لوگوں کو کیوں مخاطب کیا گیا ہے۔لیکن ہمارے نقطۂ نظر سے یہ تمام مطالب خواہ بالواسطہ ان ہی لوگوں سے مرتبط ہیں کیونکہ:

۱)قوم کے بہت سے مسائل کی باگڈور ان لوگوں کر ہاتھ میں ہے نیز اسلامی تحریک اور اسکی رہبری بھی

ایک قومی مسئلہ ہے اور یہ افراد کسی بھی طرح اس سے شانہ خالی نہیں کر سکتے ہیں۔

۲)ان میں سے اکثر باتیں براہ راستؔ ان ہی لوگوں سے مربوط ہیں۔ خاص طور سے اسلامی کانفرنس سے جڑے ہوئے اکثر علمی مراکز نے بھی اسی طرح کی تجویزیں پیش کی ہیں۔ (منجملہ پانچویں اسلامی فقہ کانفرنس کی جانب سے اسلامی احکام کے نفاذ کے بارے میں صادر شدہ تجویز) (قرارداد نمبر ۱۰)

۳)یہ افراد بنیادی کردار ادا کرنے میں گروہوں اور شہری اداروں کی جانب سے مناسب فضا قائم کر سکتے ہیں۔

منابع و ماخذ:

۱)انصاری، فاضل، قصۃ الطّوائف بین المذھبیہ والطائفیہ، دمشق، دارالاھالی، ۲۰۰۰

۲)تسخیری، محمد علی، الحوار مع الذات والآخر، تہران، مجمع جہانی تقریب مذاہب اسلامی، معاونت فرہنگی، ۱۳۸۴.

۳)ثقافۃ الدعوۃ، تہران، انتشارات حزب الدعوۃ الاسلامیۃ، عراق، بی نا، ۱۴۰۱

۴)رسالۃ المسلم فی حقبۃ العولمہ

۵)کنڈین روزنامہ ''کرسنٹ'' اداریہ، ۱۵ اگست ۱۹۸۰

۶)علامہ طباطبایی، المیزان، بیروت، مؤسسہ الأعلمی للمطبوعات، ط ۵، ۱۹۸۳م/۱۴۰۲ھ، ج ۹

۷)ھانٹر، شیرین، ''مستقبل الاسلام والغرب''، ترجمہ عربی: زینب شوربا، بیروت، دارالعلم للملایین، ۲۰۰۴

عالم اسلام میں تقریب مذاہب اور امن وسلامتی
امام خمینیؒ کی نظر میں

گروہ تحری

خلاصہ

آج اسلامی ممالک مختلف ناگفتہ بہ حالات کے شکار ہیں، جنگ وخونریزی ہو یا غربت اور پسماندگی سب یہاں پر اپنا ڈیرا ڈالے ہوئے ہے۔ مغربی استعمار بھی "اختلاف پیدا کرو اور حکومت کرو " کی حکمت عملی کے ساتھ اسلامی ممالک میں اختلافات کی آگ کو ہوا دینے میں مشغول ہے۔ یہ سب عالم اسلام میں نا امنی کے باعث بن گئے ہیں۔ اسلامی انقلاب کی کامیابی کے بعد امام خمینیؒ نے کوشش کی کہ وہ مسلمانوں کو ایک دوسرے سے نزدیک کریں اور تقریبی افکار زندہ کر کے عالم اسلام کی مشکلات کم کریں جس سے ان میں امن وسلامتی کی فضا برقرار ہو۔

سوال یہ ہے کہ امام خمینیؒ جنہوں نے تقریبی افکار کو حیات نو عطا کی، ان کے نظریہ کے مطابق مسلمانوں کے درمیان کس طرح تقریب برقرار کر کے اسلامی ممالک میں امن وامان کے ماحول کو بہتر صورت دی جا سکتی ہے۔ اس سوال کا جواب دینے کے لئے ہمیں ایک نمونہ کی ضرورت ہے۔ یہ نمونہ Amitai Etzioni کا ہے۔ وہ اتحاد قائم کرنے کے لئے چار مرحلہ بیان کرتا ہے:

۱:۔ اتحاد سے پہلے کی صورتحال

۲:۔ اتحاد آفریں طاقتیں

یہ دونوں مرحلے تقریبی عوامل قائم کرنے سے متعلق ہیں۔

۳:۔ اتحاد کا طریق کار

۴:۔ نظام کا انہی اقدار پر باقی رہنا جنکے لئے وجود میں آیا ہے۔ بالفاظ دیگر اتحاد خود مقصد نہیں ہے۔

اس نظریہ کو مدنظر رکھتے ہوئے اس تحقیقی مقالہ میں تقریبی عوامل، جن میدانوں اور شعبوں میں تقریب برقرار ہونا چاہئے اور تقریب کے مقاصد کے سلسلہ میں گفتگو کی گئی ہے۔ اگر چہ تقریب کے متعدد اہداف ذکر کئے گئے ہیں لیکن آخری مقصد امن وامان کا قیام ہے؛ کیونکہ امن وامان کی صورت میں ہی تقریب کے دوسرے اہداف منجملہ عالم اسلام میں اخلاقی اور معنوی ترقی تک دسترسی ہوسکتی ہے۔ جب جب تک امن وامان نہ ہو اس وقت تک معنوی رشد ونمو بھی ممکن نہیں ہے۔

اسلامی ممالک میں امن برقرار کرنے کے لئے انکی قدرت وطاقت میں اضافہ کرنا چاہئے۔ امام خمینی کی نگاہ میں قدرت صرف کسی خاص شعبہ کی تقویت مثلا عسکری قدرت میں اضافہ کرنے سے مخصوص نہیں ہے بلکہ اس سے آپ کی مراد داخلی وخارجی تعلقات کے پیچیدہ نظام میں عالم اسلام کی صورتحال کا بہتر ہونا ہے۔ (افتخاری، ۱۳۸۰، ص۴۵)

لہٰذا قدرت وطاقت پیدا کرنے میں بہت سے اسباب دخیل ہیں۔ تقریبی شعبوں میں اتحاد پیدا ہونے کے بعد ان اسباب کو استحکام بخشا جاسکتا ہے۔ اسی طرح امن کے مختلف پہلو ہیں لہذا مختلف شعبوں میں امن کی فضا قائم کرنا ہوگی کیونکہ تقریبی شعبوں میں برقرار اتحاد ان شعبوں میں امن قائم کرنے کا سلسلہ آسان بنا سکتا ہے۔ لہذا کہا جاسکتا ہے کہ تقریبی نظریہ عالم اسلام میں اتحاد مستحکم کر کے مسلمانوں کی قدرت میں اضافہ کا سبب بنے گا اور مختلف معنوی، فردی، ثقافتی، سیاسی، اجتماعی، اقتصادی اور عسکری شعبوں میں امن وسلامتی کی صورتحال بہتر کرنے میں مدد کرے گا۔

کلیدی الفاظ:

تقریب، امن، عالم اسلام

مقدمہ

قرآن نے سارے مسلمانوں کو "امت واحدہ" کا خطاب دیا ہے: "ان ھذہ امتکم امة واحدة و انا ربکم فاعبدون"۔ (انبیاء/۹۲)

اسلام نے بھی توحید کی جانب دعوت دے کر منتشر قوموں اور قبیلوں کو متحد کر دیا لیکن آج بہت سے

واقعات مسلمانوں میں انتشار وجدائی کے باعث بن گئے ہیں اور مسلمانوں کے ایک دوسرے سے تعلقات استکباری طاقتوں کے رائج کئے ہوئے "اختلاف پیدا کرواور حکومت کرو "جیسے اصول سے متاثر ہیں۔مخالفین اسلام اور عالمی کفر بنیاد پرستی، انتہا پسندی اور دہشت گردی جیسے حربے استعمال کرتے ہیں اور اسلام کو نقصان پہنچانے کے لئے انکی نسبت اسلام کی جانب دیتے ہیں۔

لیکن امام خمینی کی قیادت میں آنے والے اسلامی انقلاب نے اسلامی مذاہب کے درمیان تقریب اور سیاسی اتحاد کی فکر کو زندہ کردیا اور اسے عالم اسلام کے دشمنوں کی ریشہ دوانیوں کے مقابل ایک مؤثر اور عالم اسلام کے امن وامان کے لئے ایک اہم سبب جانا ہے۔ اس مضمون میں ہم اس سوال کا جواب تلاش کرنے کی کوشش کریں گے کہ امام خمینی کے نظریات کی بنیاد پر کس طرح مسلمانوں کے درمیان تقریب برقرار کرکے اسلامی ممالک کے امن کو بہتر بنایا جاسکتا ہے۔

اس سوال کا ابتدائی جواب یہ ہے کہ امام خمینی کی نگاہ میں عالم اسلام میں ایک دوسرے کی طرف جھکاؤ کی بنیاد پر ہونے والی تقریب مسلمانوں کی طاقت میں اضافہ کا باعث بنے گی اور معنوی، ثقافتی، فردی، اجتماعی، سیاسی، اقتصادی اور عسکری شعبوں میں امن کی صورتحال کو بہتر بنائے گی۔

اصطلاحات

۱:۔ تقریب

تقریب؛ کا اصل لفظ قرب ہے جو نزدیکی اور تعاون کے معنی میں ہے اور یہاں پر شیعہ اور اہلسنت کے درمیان تعاون اور مشارکت مراد ہے۔امام خمینیؒ شیعہ اور اہلسنت کو یکساں جانتے ہیں اور آپکا ماننا ہے کہ سب ایک دوسرے کے بھائی اور ایک دوسرے کے برابر ہیں:

''ہم اور برادران اہلسنت یکساں ہیں، ایک ہیں، مسلمان اور بھائی ہیں۔۔۔۔۔قضیۂ شیعہ اور اہلسنت سرے سے درکار نہیں ہیں۔(خمینی، ۱۳۷۱، ج ۶، ص ۷۷)

شیعہ اور اہلسنت بہت سے مسائل میں متفق ہیں، منجملہ یہ عقائد دونوں کے درمیان مشترک ہیں کہ:

۱۔خدا اس دنیا کا خالق وناظم ہے ۲۔معبود صرف اللہ ہے ۳۔ اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ ۴۔ اس کی ذات کا احاطہ نہیں کیا جاسکتا ۵۔وہ ازلی، ابدی اور سرمدی ہے ۶۔ساری موجودات خدا کی مخلوق ہیں ۷۔خدا متکلم اور صادق ہے ۸۔خدا زندہ ہے

ان مشترکہ عقائد کے علاوہ بعض اختلافات بھی ہیں مثلا کلام خدا کی تفسیر، مومنین قیامت کے دن خدا کو دیکھیں گے یا نہیں؛ خدا کی صفات ذات مثلاعلم، قدرت اور حیات وغیرہ میں اختلاف کہ وہ عین ذات ہیں یا زائد بر ذات ہیں، پیغمبرؐ کے بعد ان کی جانشینی کا مسئلہ وغیرہ۔اس اتفاق واختلاف نظر کی بنیاد پر شیعہ اور سنی میں باہمی تعاون کا مطلب مشترکہ دینی عقائد کی حفاظت اور ترویج نیز ثقافت اور اقتصاد وغیرہ کے میدانوں میں باہمی مشارکت ہے ۔تقریب کا مطلب ایک دوسرے میں جذب ہوجانا اور کسی مذہب کا کسی دوسرے مذہب پر غالب آجانا نہیں ہے بلکہ تقریب آپسی مفاہمت کے لئے ہے تاکہ اس طرح امت مسلمہ اپنی تعمیر میں یا دشمنوں کا مقابلہ کرنے میں امت واحد کی صورت اختیار کرلے۔

لہذا ہماری نظر میں تقریب کا مطلب دینی مشترکہ اقدار کی پاسبانی اور ترویج اور، "**للمصیب اجران و للمخطی اجر واحد** ''(سالک راہ حق کو صحیح مقصد تک پہنچنے کی صورت میں دو اجر اور غلط منزل تک پہنچنے پر ایک اجر ملے گا) کے قانون کی بنیاد پر اختلافات میں دوسروں کو معذور سمجھنا نیز اخلاقی، اجتماعی، سیاسی، اقتصادی اور عسکری زندگی میں "انما المومنون اخوہ "کے قرآنی اصول کے مطابق بحیثیت مسلمان ایک دوسرے میں اخوت و بھائی چارگی کا ہونا اور اسلامی مذاہب کے مذہبی اصولوں اور ان کے ہبروں کی توہین نہ کرنا ہے۔ (آصف محسنی، ۱۳۸۶، ص۱۹/)

۲:۔ امنیت

یہ لفظ لغوی طور پر "امن" سے لیا گیا ہے جس کے مختلف مشتقات ہیں مثلا "استیمان "اور "ایمان"۔ انکا ترجمہ خوف کے مقابلہ میں پائے جانے والے اطمینان وسکون سے کیا گیا ہے جسمیں مثبت اور منفی دونوں پہلو شامل ہیں؛ فکری اور روحانی اطمینان وسکون اور خوف، گھبراہٹ اور پریشانی کا نہ ہونا جو انسان سے اطمینان اور سکون چھین لیتے ہیں۔(اخوان کاظمی، ۱۳۸۵، ص۱۹/)

گزشتہ زمانے میں امن وسلامتی کو ایک عسکری لفظ سمجھا جاتا تھا لیکن عہد جدید میں اس لفظ سے آپسی ہماہنگی میں اضافہ، اجتماعی اور سماجی اختلافات اور کشیدگی کا کم ہونا اور مدنی احساس کا استحکام مراد لیا جاتا ہے۔(دولور، ۱۳۷۱، ص۳۸۹/)

لہذا یہ کہا جاسکتا ہے کہ آج کوئی بھی ملک صرف فوجی خطروں کے مقابلہ میں امن کی کوشش نہیں کرتا ہے بلکہ اسکے مدنظر مختلف قسم کے سیاسی، اقتصادی، ثقافتی اور ذرائع ابلاغ سے درپیش خطرے ہوتے ہیں۔امن کے مختلف

پہلووں میں فردی، اجتماعی، ثقافتی، اقتصادی، عسکری اور قومی میدانوں کا بھی شمار ہوتا ہے۔

۳:۔ عالم اسلام

اصطلاحا عالم اسلام ان سرزمینوں کو کہا جاتا ہے کہ جسکے زیادہ تر باشندے مسلمان ہوں، یہ افراد چاہے اسلامی ممالک میں رہ رہے ہوں یا غیر اسلامی ممالک میں اور چاہے ان ممالک میں جنہیں اسلامی کہا جاسکتا ہے لیکن ابھی وہ اسلامی کانفرنس تنظیم کے عضو نہیں ہیں جیسے بوسنیا اور ہرزیگووینا۔ عالم اسلام سے ہماری مراد یہی اصطلاحی تعریف ہے۔

۱۔۳:۔ نمونہ قائم کرنا

تحقیق حاضر میں، تقریب کے مختلف نظریات میں سے Amitai Etzioni کے نظریہ کو بنیاد بنایا گیا ہے:

ایٹای اٹزیونی کا ماننا ہے کہ سیاسی اتحاد، ایک ایسا عمل ہے کہ جسمیں سیاسی تقریب ایک حالت کے عنوان سے وجود میں آتی ہے اور یہ اتحاد کسی نظام کو تشکیل دینے والے عناصر کے درمیان تعلقات کے وسیع ہونے یا مستحکم ہونے کا سبب بنتا ہے۔) دوئرتی وفالتزگراف،،ص (وہ اتحاد تک رسائی کے چار مرحلے بیان کرتے ہیں:

۱:۔ اتحاد سے پہلے کی صورتحال

۲:۔ اتحادآفریں طاقتیں

۳:۔ متحد شعبے

۴:۔ اختتامی مرحلہ

الف)۔ اتحاد سے پہلے کی صورتحال

ان کی نگاہ میں اتحاد برقرار ہونے کے لئے ضروری ہے کہ مطلوبہ شعبوں میں باہمی تعلق پایا جاتا ہو۔ دوسرے لفظوں میں یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ اتحاد سے پہلے کچھ عناصر کلیدی کردار ادا کرتے ہیں جن کی کمیت و کیفیت اتحاد قائم ہونے میں بیحد موثر ہوتی ہے جن میں سے ثقافتی یکسانیت، اقتصادی باہمی تعلق اور جغرافیائی پڑوس کی جانب اشارہ کیا جاسکتا ہے۔

ب)۔ اتحادآفریں طاقتیں

پروفیسر ''اٹزیونی'' کی نگاہ میں اتحاد برقرار کرنے کے لئے تین عناصر ہیں: ۔فوجی اور انتظامی طاقت

۔مادی اور اقتصادی طاقت یا اقتصادی اور تکنیکی عوامل اور ادارتی صلاحیت ۔،ثقافتی اقدار افکار پر مشتمل اعتقادی طاقت۔

ج)۔ متحد شعبے

اس مرحلہ میں افراد اور چیزوں کا تبادلہ ہوتا ہے اور سیاسی شعبوں میں اتحاد مزید مستحکم ہو جاتا ہے اور ایک شعبے سے دوسرے شعبے میں سرایت کرتا جاتا ہے۔

د)۔ اختتامی مرحلہ

اس مرحلہ میں متعدد شعبوں سے مل کر بنا ہوا نظام وہ کام شروع کر دیتا ہے کہ جس کی خاطر وہ وجود میں آیا ہے؛ بالفاظ دیگر اتحاد خود کوئی ہدف نہیں ہے بلکہ اس پر مرتب ہونے والے سیاسی، اقتصادی اور اجتماعی اثرات اہم ہیں۔(کاظمی،۱۳۷۲،ص۷۷۔۷۴)

''اٹزیونی'' نے اتحاد کے لئے جن مراحل کا تذکرہ کیا ہے،اس تحقیق میں انکو بنیاد بنایا گیا ہے اس فرق کے ساتھ انہوں نے دوسرے مرحلہ میں اتحاد آفریں قوتوں میں فوجی اور انتظامی طاقت کو شمار کیا ہے لیکن چونکہ اتحاد سے ہماری مراد وہ تعلقات ہیں جو ممالک کے درمیان مفاہمت اور تعاون کی بنیاد پر استوار ہوتے ہیں، اسلئے ہم نے اس طاقت کو اتحاد آفریں طاقتوں میں شمار نہیں کیا ہے کیونکہ فوجی طاقت کے بل بوتے پر مسلمانوں کے درمیان حقیقی اتحاد برقرار نہیں کیا جاسکتا ہے اور اس طاقت کے ذریعہ کوئی اتحاد قائم بھی ہو جائے تو وہ وقتی اور ظاہری ہوگا اور اس میں استحکام نہیں ہوگا۔لیکن عالم اسلام میں مثلاً اقتصادی مشارکت اتحاد کا سبب بن سکتی ہے کیونکہ مسلمان یہ بات بخوبی جانتے ہیں کہ عالم اسلام پر مغرب کا اقتصادی تسلط انکی جدائی کا ایک سبب ہے۔مغرب اقتصاد عالم کی لگام اپنے ہاتھ میں لے کر جس طرح چاہتا ہے اسلامی ممالک کی سیاسی اور ثقافتی حکمت عملی طے کرتا ہے۔لیکن اسلامی ممالک میں اقتصادی مشارکت اور ایک دوسرے کی ضرورتوں کا پورا کرنا یقیناً مغرب سے وابستگی کو ختم کر کے تقریب کی زمین ہموار کرے گا۔

اس تحقیق میں اتحاد کے پہلے اور دوسرے مراحل یعنی اتحاد سے پہلے کی صورتحال اور اتحاد آفریں طاقتوں کا تعلق تقریبی عوامل میں سے ہے۔۔تیسرا مرحلہ تقریبی شعبوں سے متعلق اور اختتامی مرحلہ اغراض تقریب سے متعلق ہے جسمیں سب سے اہم ہدف امن وسلامتی ہے جسکے بغیر عالم اسلام میں اتحاد ممکن نہیں ہے۔

۲۔۳:۔ اتحاد برقرار کرنے کا طریقہ

''امیٹای اٹزیونی'' کے نظریہ کو مدنظر رکھتے ہوئے تقریبی عوامل اور تقریبی شعبوں کے سلسلہ میں گفتگو کرنی چاہئے۔امام خمینی کے مطابق تقریبی عوامل کو انسانی اور غیر انسانی عوامل میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

تقریب کے انسانی عوامل فقہا،علما، دانشور،خواص،اساتذہ،طلاب اور اسلامی ممالک کے سربراہ ہیں۔

تقریب کے غیر انسانی عوامل مشترکہ مذہبی اصول،عمومی ذرائع ابلاغ ،تعلیمی ادارے، اقتصادی مشارکت اور اسلامی ثقافت ہیں۔

۱۔۲۔۳:۔تقریب کے انسانی عوامل

الف)۔ فقہا:تقریب کے سب سے اہم انسانی عامل فقہا ہیں۔لوگوں کے نزدیک انکے مقام ومرتبہ کی وجہ سے انکے نظریات سبھی کیلئے لائق احترام اور قابل قبول ہوتے ہیں۔امام خمینی ان کے کردار کے بارے میں کہتے ہیں:"جس طرح وہ عمل کرتے ہیں شیعوں کو بھی ویسے ہی عمل کرنا چاہئے اور انکی نماز جماعت میں شرکت کرنی چاہئے "لہذا اس گروہ کو لوگوں کو بیدار کرنا چاہئے اور مختلف فتاوی کے ذریعہ اتحاد بین المسلمین کی راہ میں قدم آگے بڑھانا چاہئے۔امام خمینی کہ جن کا شمار منادیان اتحاد میں ہوتا ہے، نے شیعہ اور اہلسنت کے درمیان اتحاد کے لئے متعدد فتوے صادر فرمائے مثلا جب آپ سے اہلسنت کی نماز جماعت میں شرکت کے بارے میں سوال ہوا " کہ آپ کا فتوا ہے کہ ہم اہلسنت کی نماز جماعت میں شرکت کریں تو کیا یہ نماز نیت وغیرہ میں بھی شیعوں کی نماز جماعت کی طرح سے ہے؟ "آپ نے جواب میں فرمایا: "جس طرح وہ عمل کرتے ہیں، (شیعہ بھی) اسی طرح انجام دیں"(خمینی،۱۳۶۶،ص۲۷۸/)

دوسری جگہ فرماتے ہیں:"جس طرح سارے حجاج رائج طریقہ کے مطابق طواف کرتے ہیں آپ لوگوں کو بھی اسی طرح طواف کرنا چاہئے۔اور کم فہم افراد جو کام کرتے ہیں ان سے پرہیز کرنا چاہئے۔وہ کام جو مذہب کی کمزوری کا باعث بنتے ہیں ان سے پرہیز کرنا چاہئے اور دونوں وقوف (عرفات اور مشعرالحرام میں رکنا) کے سلسلہ میں اہلسنت قاضیوں کا حکم ماننا ضروری اور کافی ہے اگرچہ اس کے خلاف حقیقت ہونے کا یقین ہو ''(خمینی،۱۳۷۹،ص۳۵/)

اسی طرح انھوں نے ایک دوسری جگہ یہ فتوا دیا ہے:

''ضروری ہے کہ ایرانی اور تمام ممالک کے شیعہ برادران مسلمانوں کے درمیان اختلاف پھیلانے والے نادانی کے تمام کاموں سے پرہیز کریں۔ان کے لئے ضروری ہے کہ اہلسنت کی جماعتوں میں حاضر ہوں اور

اپنے گھروں میں نماز جماعت پڑھنے سے پرہیز کریں"۔(خمینی،۱۳۷۱، ج۹/ص۱۷۷۔۱۷۶)

وہ علماء کی ذمہ داری کے سلسلہ میں کہتے ہیں:

دوسرا گروہ علمائے اسلام اور مراجع عالی مقام کا ہے۔انکی ذمہ داری بھی بہت زیادہ ہے۔ایک لحاظ سے علمائے اسلام کی ذمہ داری سب سے زیادہ ہے "(خمینی،۱۳۷۹ ،ص۳۵/)

ب)۔خواص اور تعلیم یافتہ افراد:انہیں عالم اسلام کی مصلحتوں کے مطابق اپنی علمی تحقیقات اور تبلیغی امور انجام دینے چاہئیں اور ان تحقیقات میں اپنے مذہب کی مصلحتوں سے زیادہ عالم اسلام کی مصلحتوں کو مدنظر قرار دیں۔ علمی مسائل میں بھی ایک دوسرے سے تبادلۂ نظر کریں جس طرح ابوحنیفہ نے دو سال امام صادق علیہ السلام کے سامنے زانوئے تلمذتہ کیا یا شیخ مفید بعض علما اہلسنت کے درس میں شرکت کرتے تھے۔(آصفی،۱۳۸۶،ص۲۷/)

ج)۔ اساتذہ اور طلاب: یہ گروہ سوال و جواب کے جلسات منعقد کر کے استدلالی گفتگو کو رواج دے سکتے ہیں۔ اختلافی مسائل حل کر سکتے ہیں اور اتحاد کے نئے افق تلاش کر سکتے ہیں۔

د)۔اسلامی ممالک کے سربراہ:امام خمینی کے بقول انہیں ان معمولی اختلافات سے دور رہنا چاہئے، تخریبی کاموں سے پرہیز کرنا چاہئے اور ایک دوسرے سے متحد ہو جانا چاہئے:

''اگر اسلامی ممالک کے سربراہ، مومن عوام کے نمائندے اور اسلامی احکام کو مکمل طور پر نافذ کرنے والے ہوتے ان معمولی اختلافات سے دور رہتے، تخریبی اور اختلاف پیدا کرنے والے کاموں سے پرہیز کرتے اور متحد ہو کر ایک قالب میں ڈھل جاتے تو امریکا اور دوسرے دشمنوں کے گماشتے یہ مٹھی بھر بدبخت یہودی اس طرح کی حرکتیں انجام نہیں دے سکتے تھے۔۔۔) "خمینی، روح اللہ، بی تا،ص۲۵۔۲۴/)

آج اسلامی سربراہوں اور اسلامی ممالک کے حکام کے لئے ضروری ہے کہ ان معمولی و موسمی اختلافات سے دور رہیں۔عرب اور عجم، ترک اور فارس نام کی کوئی چیز نہیں ہے، سربراہوں کی ذمہ داری ہے کہ بیٹھ کر ایک دوسرے سے مفاہمت کریں۔۔"(خمینی،۱۳۷۸،ص۱۵/۱۴)

اسلامی ممالک کے سربراہوں کو اختلافات کی جڑیں تلاش کر کے انہیں خشک کر دینا چاہئے اسی طرح انہیں اتحاد برقرار کرنے کی راہیں تلاش کرنا چاہئیں۔

۲۔۲۔۲۔تقریب کے غیر انسانی عوامل

الف)۔ مشترکہ اسلامی اصول:تقریب میں موثر غیر انسانی عوامل میں سے ایک وہ مشترکہ اسلامی

اصول ہیں جن پر شیعہ اور اہلسنت دونوں کا عقیدہ ہے مثلاً توحید، ساری موجودات کا مخلوق ہونا اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خاتمیت۔ امام خمینیؒ بھی انہی مذہبی مشترکہ اصولوں مثلاً اسلام، قرآن اور حج پر تاکید کرتے ہوئے مسلمانوں کو دعوت اتحاد دیتے ہیں۔ منجملہ آپ فرماتے ہیں: "اگر سب کا مقصد ایک ہو اور وہ اسلام ہے، تو سارے اختلافات ختم ہو جائیں گے "(خمینی، ۱۳۷۱، ج ۱۹/ص ۲۹) اسی طرح آپ تاکید کرتے ہیں کہ اس اتحاد کی قرآن نے بھی تاکید کی ہے اور ائمہ اطہار علیہم السلام نے بھی۔ (ایضا، ج ۱۶/ص ۴) خداوند عالم نے قرآن مجید میں کہ جسے شیعہ اور اہلسنت دونوں مانتے ہیں، مسلمانوں کو اس دنیا میں بھی اور بہشت میں بھی ایک دوسرے کا بھائی کہا ہے۔ (ایضا، ص ۱۱۲)۔

آپ حج کی اہمیت کے سلسلہ میں فرماتے ہیں: "ضروری ہے کہ حجاج بیت اللہ اسلام و معنویت کے اس عظیم عمومی اجتماع میں آپسی بھائی چارگی کو زیادہ سے زیادہ بڑھائیں، اسلام اور مسلمانوں کی عظیم مصلحتوں کو فرقہ پرستی کی قربانی نہ بنائیں اور اپنے مسلمان بھائی کو زیادہ سے زیادہ توحیدکلمہ) اتحاد (اور جاہلانہ تعصب سے پرہیز کرنے کی جانب متوجہ کریں۔ "(ایضا، ج ۲۰/ص ۲۱)

ب)۔ ذرائع ابلاغ عامہ: اتحاد میں دوسرا موثر غیر انسانی عامل، ذرائع ابلاغ عامہ ہیں کہ جن میں سب سے اہم ٹیلیویزن ہے۔ ٹیلیویزن اپنے ناظرین پر بہت موثر ہوتا ہے، لہذا اتحاد کی راہ میں ایک ذریعہ کے طور پر اس سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ ریڈیو، اخبار اور میگزین بھی ذرائع ابلاغ عامہ میں سے ہیں جن سے تقریب کے سلسلہ میں مدد لی جا سکتی ہے۔

ج)۔ تعلیمی ادارے: تیسرا غیر انسانی عامل تعلیمی ادارے ہیں۔ مختلف اسلامی مذاہب کے پیروکاروں پر مشتمل مدارس کا قیام ہو، عالم اسلام کی ایک یونیورسٹی ہو کہ جسکا علمی، تحقیقی اور تعلیمی عملہ سارے اسلامی ممالک پر مشتمل ہو، ساری اسلامی سرزمینوں میں اس کا شعبے ہوں، جن میں سارے اہم فقہی، فلسفی اور کلامی مذاہب کی تدریس ہوتی ہو۔ یہ ان اقدامات میں سے ہے جو تقریب کی راہ میں بہت موثر ثابت ہو سکتے ہیں۔

د)۔ اقتصادی تعاون: اسلامی ممالک کی آپس میں اقتصادی مشارکت و تعاون تقریب کے اہم عوامل میں سے ہے جو عالم پر مغرب کے اقتصادی تسلط کو کم کرنے کے ساتھ ساتھ اسلامی ممالک کی ایک دوسرے سے وابستگی کا سبب بن سکتے ہیں۔ امام خمینیؒ نے مسلمانوں میں اختلاف ڈالنے کے لئے دشمنان اسلام کا ایک حربہ عالم اسلام کے قدرتی وسائل پر قبضہ کرنا بتایا ہے:

" وہ نجس ہاتھ جو ان ممالک میں شیعہ اور اہلسنت میں اختلاف ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں، یہ نہ شیعہ

ہیں اور نہ اہلسنت ، یہ استکباری گماشتے ہیں جو اسلامی مالک اور ان کے قدرتی وسائل کو مسلمانوں کے ہاتھ سے لینا چاہتے ہیں۔(ایضا، ج۱،ص۸۸)

اقتصادی مشارکت وتعاون اسلامی اتحاد برقرار ہونے کی راہ میں ایک اہم سبب ہونے کے ساتھ ساتھ اسلامی معاشروں کی اقتصادی اور تجارتی توسیع وترقی اور انکی بہبودی میں بھی معاون ہوسکتا ہے۔

ھ)۔اسلامی ثقافت: مسلمانوں کے درمیان ایک اسلامی ثقافت رائج کرنا بھی تقریبی عوامل میں سے ہے کیونکہ امام خمینیؒ کے بقول "قوموں کی تعمیر کرنے والی چیز کا نام صحتمند ثقافت ہے۔اگر ثقافت صحیح ہوتو پوری قوم کی اصلاح ہوجاتی ہے"۔(خمینیؒ ،۱۳۷۲،ص۱۷۵) لہذا مغربی اور مادی ثقافت کے بجائے اسلامی ثقافت رائج کرکے اتحاد کی راہ آسان بنائی جاسکتی ہے۔

یہ تقریب عوامل کے ہیں،لیکن یہ تقریب مختلف شعبوں میں برقرار ہونی چاہئے جس سبیہ عالم اسلام کو امن وامان فراہم کرسکے۔

تقریبی دائرے:

۱۔ اعتقادی دائرہ

۲۔ باطنی اور روحی دائرہ

۳۔ اجتماعی دائرہ

۴۔ سیاستی دائرہ

۵۔ ثقافتی دائرہ

۶۔ اقتصادی دائرہ

۷۔ علمی دائرہ

۸۔ عسکری دائرہ

جس دائرہ میں اتحاد سب سے زیادہ اہم ہے وہ عقائد کا دائرہ ہے۔عقائد میں اتحاد برقرار ہونے کا مطلب ایک دوسرے کے عبادتی اصولوں کا احترام کرنا اور گفتگو نیز ایک دوسرے پر استدلالی تنقید کرنے کی راہ ہموار کرنا ہے۔یہ شیعہ اور اہلسنت کے مشترکہ اصولوں مثلا قبلہ کو ایک ماننا اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خاتمیت پر یقین رکھنا وغیرہ سے ہٹ کر ہے۔امام خمینیؒ بھی شیعہ اور اہلسنت کے درمیان عقائد کے اتحاد پر تاکید کرتے ہیں اور

عملی اتحاد کو اتحاد عقائد کا نتیجہ جانتے ہیں: "اگر سب کا مطمح نظر ایک ہو تو یہ اتحاد کلمہ کی جانب دعوت ہے۔ عقائد کے اتحاد کی بنیاد پر ہی اتحاد کلمہ اور اتحاد عمل وجود میں آتا ہے۔"

دوسرا دائرہ باطن و روح کا دائرہ ہے یعنی ایک دوسرے کے لئے الفت و محبت اور حسن ظن کا پیدا ہونا، دوسرے مذاہب کے پیروکاروں سے محبت کرنا، ان سے ہمدردی اور جان و دل سے اس حقیقت پر یقین رکھنا کہ سارے مذاہب کی طینت ایک ہی ہے۔ (خسروشاہی، ۱۳۸۱، ص ۷۰۔۲۹)

شیعہ اور اہلسنت میں حسن ظن پیدا کرنا چاہئے۔ امام خمینی نے کوشش کی کہ وہ مسلمانوں کے درمیان محبت پیدا کریں۔ وہ ہمیشہ مسلمانوں کو ایک دوسرے کے بھائی کے عنوان سے خطاب کرتے تھے: "ہم اہلسنت مسلمانوں کے ساتھ ہیں، ہم دونوں ایک ہیں، مسلمان اور بھائی ہیں۔۔ " (خمینی، ۱۳۷۱، ج ۵، ص ۷۷)۔ سیاسی اور اجتماعی شعبوں میں بھی مسلمانوں کو متحد ہونا چاہئے، مظلوموں کی حمایت میں قیام کرنا چاہئے، بین الاقوامی اداروں میں یکساں موقف اختیار کرنا چاہئے اور اس نکتہ کی جانب بھی متوجہ رہنا چاہئے کہ سیاست اسلام سے جدا نہیں ہیا ور جیسا کہ امام خمینی نے بارہا فرمایا ہے، یہ تلقین دشمنان اسلام کے حربوں میں سے ہے۔

مشترکہ اسلامی ثقافت اتحاد اور اسلامی معاشروں میں نفوذ کر جانے والی مغربی ثقافت اختلاف کا باعث بنتی ہے کیونکہ مغرب کی تھوپی جانے والی ثقافت کے بعد کج فہمی، حقیقی اسلام سے دور ہونے اور اسلامی احکام ترک کرنے کا باعث بنتی ہے۔ لہذا مسلمانوں کا فریضہ ہے کہ وہ ثقافتی میدان میں اتحاد برقرار کر کے مغرب کی ثقافتی یلغار کا مقابلہ کریں اور اپنے لئے اسلامی ثقافت کے خدوخال تیار کریں۔

امام خمینی اس سلسلہ میں فرماتے ہیں:

یقیناً ہر معاشرہ کی ہستی میں کارفرما سب سے اہم عنصر اس معاشرے کی ثقافت ہے۔۔۔۔ اگر کسی معاشرے کی ثقافت کسی مخالف ثقافت سے وابستہ ہو اور اس سے اپنی زندگی کی بھیک مانگ رہی ہو تو یقیناً اس معاشرے کے دوسرے شعبے بھی اسی مخالف ثقافت کی جانب مائل ہو جائیں گے اور اسی میں جذب ہو جائیں گے۔۔۔ "(ایضا، ج ۱۵، ص ۱۶۰)

علمی اور عسکری شعبوں میں ضرورت اتحاد بالکل واضح ہے کیونکہ آج علم اور ٹکنولوجی بہت تیزی سے ترقی کر رہے ہیں اور افسوس کہ اسلامی ممالک اس قافلہ سے پیچھے رہ گئے ہیں۔ انہیں علمی شعبے میں اتحاد برقرار کر کے خود کو اس قافلہ تک پہنچانا بلکہ اس سے آگے نکلنا چاہئے۔ عسکری شعبے میں بھی ہر روز جدید اسلحے بن رہے ہیں ایسے وقت میں مسلمانوں کو بھی عسکری شعبے میں اتحاد قائم کر کے اپنی قدرت و طاقت میں اضافہ کرنا چاہئے۔ امام خمینی کی تاکید تھی

کہ مسلمانوں کو متحد ہو کر دس کروڑ سے زائد کی تربیت یافتہ مشترکہ دفاعی فوج بنانی چاہئے جو ذخیرہ کے طور پر ہو اور دسیوں کروڑ کا لشکر ایک پرچم تلے اکٹھا ہو۔ (خمینی، ۱۳۷۹، ج ۱۸/، ص ۹۲)

۳۔۲۔۳۔ امن وامان برقرار کرنے کا طریقہ

امن وسلامتی برقرار کرنے کے لئے پہلے تقریب کے مقاصد معین ہونا چاہئیں۔ امام خمینی کے نظریہ کے مطابق تقریب کے اہداف ومقاصد مندرجہ ذیل ہیں:

الف)۔ اسلامی عزت کا حصول اور عظمت رفتہ کی واپسی۔ اسلامی ممالک کی خارجہ پالیسی اور دوسرے مالک سے تعلقات میں اسلامی عزت حاکم ہونی چاہئے۔ قرآن کریم میں سورہ نسا آیت اور سورہ منافقون آیت میں مومنوں اور مسلمانوں کی عزت پر تاکید کی گئی ہے۔ لہذا اسلامی حکومتوں کو یہ کوشش کرنی چاہئے کہ وہ دوسرے ممالک سے تعلقات کے وقت اپنی عزت محفوظ رکھیں۔ تقریب کی صورت میں ہی مسلمانوں کی عظمت محفوظ رہے گی اور دشمن اسلام پر حملہ کرنے کی فکر اپنے دل ودماغ سے نکال دے گا۔ امام خمینی بھی اس پر تاکید کرتے ہیں: "اگر مسلمان قومیں اور حکومتیں ایک دوسرے سے جدا نہ ہوتیں، اگر مسلمان متحد ہوتے تو اس طرح رسوا نہ ہوتے، غیروں اور ان کے گماشتوں کے قبضہ میں نہ ہوتے۔۔۔۔ " (خمینی، ۱۳۷۱، ج ۵/، ص ۱۷۴)

ب)۔ طاقت کا حصول اور دشمنان اسلام پر کامیابی: اسلامی اتحاد دشمن سے مقابلہ کے لئے امت مسلمہ کے طاقتور ہونے اور اس کے اوپر ان کی کامیابی کا سبب ہے۔ قرآن کریم نے اس نکتہ پر تاکید کی ہے کہ اتحاد ثبات قدم اور مضبوطی کا باعث بنتا ہے اور اختلاف شکست، کمزوری اور قدرت وطاقت کے ہاتھ سے نکل جانے کا باعث بنتا ہے۔ امام خمینی قرآن کریم اور اسلام کی پیروی کرتے ہوئے مسلمانوں کو دعوت اتحاد دیتے ہیں اور انکا ماننا ہے کہ مسلمانوں کی کامیابی کا راز اتحاد میں پوشیدہ ہے:

''اے مسلمانان عالم اور اے مکتب توحید کے پیروکاروں 1 اسلامی ممالک کی ساری مشکلات کی جڑ اختلاف ہے اور کامیابی کا راز، اتحاد اور یگانگت میں پوشیدہ ہے۔'' (ایضا، ص ۲۲۶/)

ج)۔ اسلامی استقلال کا حصول: مغرب کی لالچی نگاہیں ہمیشہ اسلامی ممالک پر لگی رہتی ہیں کیونکہ مسلمانوں کو سرزمینیں مختلف قدرتی وسائل سے بھری ہوئی ہیں۔ دنیا میں ذرائع قوت وطاقت کا ایک بڑا حصہ مشرق وسطی میں ہے۔ افریقا کے اہم علاقوں میں قدرتی وسائل مسلمانوں کے ہیں۔ تنہا وہ چیز جو دشمنان اسلام کی طمع میں رکاوٹ بن سکتی ہے اور ان اسلامی ممالک کے استقلال کو واپس لوٹا سکتی ہے، اتحاد ہے۔ امام خمینی اس سلسلہ میں

فرماتے ہیں:

ہم اس وقت پوری دنیا کے مقابلہ میں ثابت قدم رہ سکتے ہیں، ہم یہ اس وقت کہہ سکتے ہیں کہ ہم نہ تو مغضوب علیہم کی طرف جائیں گے اور نہ ضالین کی طرف، نہ مغرب کا رخ کریں گے اور نہ مشرق کا، یہ سب ہم اس وقت کر سکتے ہیں اور صراط مستقیم پر گامزن رہ سکتے ہیں جب ہم سب متحد ہوں "(ایضا، ج۱۹،ص۱۹۴)

د)۔ قاعدہ نفی سبیل کا نفاذ: قرآن کریم فرماتا ہے: "خدا کفار کے لئے صاحبان ایمان پر کوئی راہ نہیں کھولی ہے۔ ہرگز ایسا نہیں ہونا چاہئے، انہیں مسلمانوں پر کسی طرح کا تسلط اور ان کے خلاف کوئی راہ نہیں ملنی چاہئے۔ **لن یجعل اللہ للکافرین علی المومنین سبیلا** "ان مشرکوں اور فاسد طاقتوں کو کسی طرح کا راستہ نہیں ملنا چاہئے۔۔۔ "(ایضا، ج۳،ص۴) قاعدہ نفی سبیل کے دو پہلو ہیں؛ مثبت اور منفی۔ منفی پہلو مسلمانوں کے حالات اور انکی اجتماعی اور سیاسی تقدیر پر غیر ملکیوں کے مسلط ہونے کی نفی کرتا ہے اور مثبت پہلو سیاسی استقلال کی حفاظت کرنے اور دوسروں سے وابستگی کی راہیں بند کرنے کے سلسلہ میں امت مسلمہ کا دینی فریضہ بیان کرتا ہے۔(سجادی، ۱۳۸۳،ص۵۸)

اتحاد بین المسلمین اسلام کے اس اہم اور بنیادی اصول کو عملی بنانے کا راستہ ہموار کر سکتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ اتحاد اپنے آخری مقصد یعنی عالم اسلام میں امن وسلامتی کی فراہمی تک کیسے پہنچ سکتا ہے۔

تقریبی شعبوں اور امن وسلامتی کے عوامل میں آپسی رابطہ

عوامل امن سے مراد ہر وہ چیز ہے جو ممالک میں امن وسلامتی کی فضا ہموار کرنے میں مددگار ثابت ہو۔ مختلف ممالک کے عوامل امن کے سلسلہ میں مختلف نظریات ہیں منجملہ جنگی اسلحے فراہم کرنا، امن کے معاہدے کرنا، عالمی مقبولیت حاصل کرنا وغیرہ۔(روشندل،۱۳۷۴،ص۲۹۔۲۸)

لیکن یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ امن وسلامتی فراہم کرنے والا سب سے اہم عامل، طاقت ہے اور آج قدرت وطاقت سے مراد صرف عسکری قدرت وطاقت نہیں ہوتی ہے اگر چہ یہ بھی غیر ضروری اور بیکار نہیں ہے لیکن کافی بھی نہیں ہے۔۔امام خمینیؒ کی نگاہ میں قدرت صرف کسی خاص شعبہ کی تقویت مثلاً عسکری قدرت میں اضافہ کرنے سے مخصوص نہیں ہے بلکہ اس سے آپ کی مراد داخلی وخارجی تعلقات کے پیچیدہ نظام میں عالم اسلام کی صورتحال کا بہتر ہونا ہے۔ (افتخاری، ایضا،ص۴۵)

لہٰذا قدرت حاصل کرنے کے عوامل کو مادی ومعنوی عوامل میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ مختلف شعبوں میں

تقریب، ان عوامل تک رسائی کو آسان بنا سکتی ہے، ذیل میں اسکا خاکہ پیش کیا جارہا ہے:

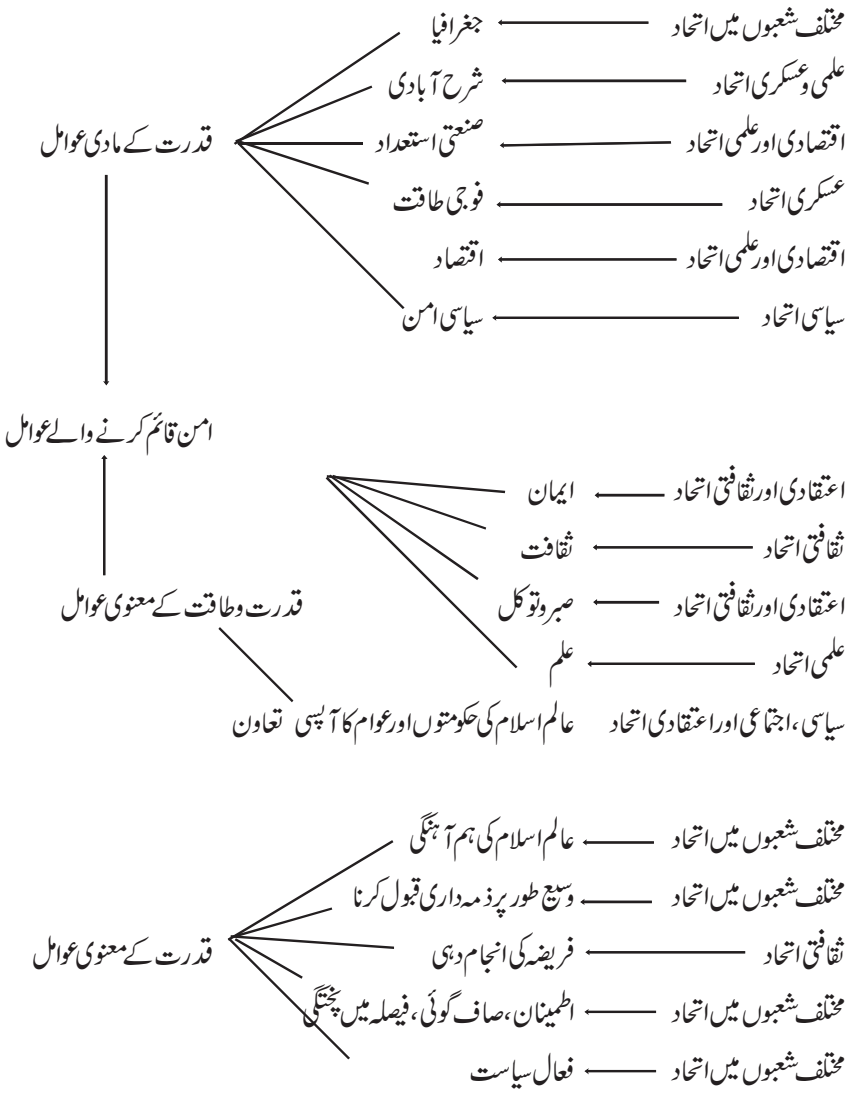

طاقت کے مادی عوامل میں سے ایک جغرافیا۔ یقیناً جغرافیائی حیثیت طاقت پر بہت موثر ہوتی ہے۔ اچھی اور معتدل آب وہوا، سمندروں تک رسائی اور قدرتی وسائل کا ہونا؛ ان سب کا ملک کو طاقتور بنانے میں اپنا ایک کردار ہے۔ زیادہ تر اسلامی ممالک میں اچھی آب وہوا ہے، سمندروں تک ان کی رسائی ہے اور وہ قدرتی

وسائل سے سرشار ہیں۔ اگر یہ ممالک اپنے درمیان اتحاد قائم کرلیں تو اس کے زیر سایہ وہ ان ذرائع کو قدرت میں تبدیل کر سکتے ہیں۔ امام خمینی اس سلسلہ میں فرماتے ہیں:

"اگر یہ اسلامی ممالک، یہ حکومتیں کہ جن کے پاس سب کچھ ہے.... یہ ممالک جن کے پاس افراد بھی زیادہ ہیں، قدرتی وسائل کی بہتات بھی ہے، اگر یہ سب متحد ہو جائیں، تو اس اتحاد کے زیر سایہ کسی چیز، کسی ملک اور کسی طاقت کے محتاج نہیں ہوں گے بلکہ وہ ان کے آگے دست سوال دراز کریں گے"۔ (خمینی، روح اللہ، ۱۳۷۸،ص ۴۱/۱)

شرح آبادی بھی طاقت کا ایک اہم عامل ہے، کیونکہ آبادی عسکری اور دوسرے تعمیری امور کا سرچشمہ ہوتی ہے۔ البتہ آبادی کی کیفیت اور اسکی تعلیمی سطح بھی اہمیت کی حامل ہے۔ علمی اتحاد کے ذریعہ عالم اسلام کی علمی سطح کو بہتر بنایا جاسکتا ہے اور عسکری اتحاد کے ذریعہ اس پراکندہ طاقت کو منظم شکل دی جاسکتی ہے۔ اس طرح آبادی کے اس عامل سے عالم اسلام کی طاقت بڑھانے میں فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔

ایسے دور میں جبکہ ہر چیز صنعتی ہوگئی ہے، ممالک کی صنعتی استعداد بھی طاقت کے حصول میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ علمی اور اقتصادی شعبوں میں اتحاد برقرار کر کے مسلمان اپنی علمی تحقیقات کا تبادلہ اور ٹکنولوجی کو ایک دوسرے تک منتقل کر سکتے ہیں۔ اسطرح آپسی تعاون سے وہ اس صنعتی زمانے سے پیچھے نہیں رہیں گے اور انکی طاقت میں اضافہ ہوگا۔

عالمی تعلقات کے میدان میں اقتصاد بھی قدرت کے بنیادی عوامل میں سے ہے۔ اقتصادی مضبوطی، قدرت وطاقت کو بھی اپنے ساتھ لاتی ہے۔ اسی وجہ سے امام خمینی خود کفیلی پر بہت زیادہ تاکید کرتے تھے اور فرماتے تھے: "اگر ہم بھوکے رہیں، پیدل چلیں، گوشہ نشین ہو جائیں لیکن ہم خود کفیلی کی جانب قدم بڑھا رہے ہوں تو یہ اس سے بہتر ہے کہ دوسروں کے دست نگر ہوں اور خوشحال ہوں"۔ (خمینی، ۱۳۷۹، ج ۷،ص ۱/۱)

اسلامی ممالک علاقائی حدود سے ماورا اقتصادی اداروں کی تقویت کر کے، ان پر استکباری طاقتوں کے اثرات ختم کرنے کی کوشش کے ذریعہ، مشترکہ اسلامی بازار قائم کر کے، اسلامی ممالک میں اقتصادی مشارکت کے لئے جغرافیائی حدود ختم کر کے اور یکساں زر مبادلہ رائج کرنے کی کوشش کر کے، اپنی اقتصادی حیثیت مضبوط بنا سکتے ہیں اور اس طرح اپنی طاقت میں اضافہ کر سکتے ہیں۔

اس دور میں مستقل اور آزاد سیاست کا ہونا بھی طاقت کے عوامل میں سے ہے۔ داخلی اور عالمی سطح پر سیاسی اتحاد اور متحدہ و یکساں موقف اختیار کر کے طاقت کے اس عامل سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔

طاقت کے معنوی عوامل میں سے ایک ایمان ہے۔ امام خمینی فرماتے ہیں: "جب کام خدائی ہو جائیں

تو دوسری طاقتوں کا خوف ختم ہوجاتا ہے۔" (خمینی، ۱۳۷۱، ج ۵، ص ۳۷) مسلمانوں کا خدا پر ایمان ہے لیکن وہ اتحاد و بھائی چارگی قائم کرکے، خدائی احکام پر عمل کرکے اور اپنے درمیان دینی ثقافت رائج کرکے اس سرمایہ سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

ایک غنی ثقافت کا ہونا بھی طاقت کے عوامل میں سے ہے۔ اگر دو ملک مادی ذرائع کے اعتبار سے برابر ہوں تو وہ ملک زیادہ طاقتور ہے جسکے پاس غنی ثقافتی عوامل ہوں۔ (روشندل، ایضا، ص ۸۰) مسلمان ثقافتی شعبہ میں اتحاد، مغربی ثقافت سے دوری اور حقیقی اسلامی ثقافت کی جانب واپس آ کر طاقت کے اس عامل سے بحسن و خوبی استفادہ کر سکتے ہیں۔ صبر اور خدا پر توکل بھی طاقت کے عوامل میں سے ہے۔ ثقافتی شعبہ میں اتحاد اور حقیقی اسلامی ثقافت کو ایک بار پھر سے رائج کرکے طاقت کے اس عامل سے بھی استفادہ کیا جا سکتا ہے۔

آج کی دنیا میں کسی بھی ملک کی طاقت میں علم کا بہت بلند مقام ہے۔ اسلام نے بھی حصول علم کی بہت تاکید کی ہے۔ امام خمینی اس سلسلہ میں کہتے ہیں: "اسلام ان ادیان میں سرفہرست ہے جنہوں نے علم اور مہارت کو سراہا ہے اور لوگوں کو حکم دیا ہے کہ جہاں کہیں بھی علم پائیں، چاہے کسی کافر کے پاس ہی کیوں نہ ہو، اسے حاصل کریں" (خمینی، ۱۳۷۹، ج ۱۴، ص ۳۶۰) مسلمان علمی اتحاد کے ذریعہ اپنی معلومات کا تبادلہ کر سکتے ہیں اور اس طرح مختلف علمی شعبوں میں خودکفیل ہوکر طاقت کے اس عامل سے اچھے انداز میں فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

عالم اسلام کی حکومتوں اور عوام کا باہمی تعاون بھی قدرت کے عوامل میں سے ہے۔ یہ تعاون یکساں عقائد، یکساں سیاسی اہداف، مصلحت اندیشی، حقوق کی دادرسی اور ایک قیادت میں ہوسکتا ہے۔ عقائد، سیاست اور اجتماعی شعبہ میں اتحاد اس عامل کی پشت پناہی کر سکتا ہے۔

عالم اسلام کی ہم آہنگی اور وسیع طور پر ذمہ داری قبول کرنا بھی طاقت کے عوامل میں سے ہے۔ مسلمان مختلف شعبوں میں اتحاد کے ذریعہ اس ہم آہنگی کو روز بروز بہتر بنا سکتے ہیں اور اپنے اندر ذمہ داری قبول کرنے کی روح بیدار کر سکتے ہیں۔ اس طرح وہ اپنے ہم مذہب افراد کے سلسلہ میں احساس ذمہ داری کرکے اپنی طاقت میں اضافہ کر سکتے ہیں۔

قدرت کے دوسرے عوامل فریضہ کی انجام دہی، اطمینان، صاف گوئی اور فیصلہ میں پختگی ہیں۔ ثقافتی شعبہ میں اتحاد اور حقیقی اسلامی ثقافت کی جانب واپس آ کر ہم اس اہم اصول کو اپنا سکتے ہیں کہ ہمیشہ اپنا فریضہ انجام دینے کی کوشش میں رہنا چاہئے نہ کہ نتیجہ حاصل کرنے کی۔ اسی طرح مختلف شعبوں میں اتحاد برقرار کرکے اور اپنے اندر خود اعتمادی پیدا کرکے اطمینان، صاف گوئی اور گفتگو میں پختگی حاصل کر سکتے ہیں۔ امام خمینی ہمیشہ اپنے موقف

اور نقطہ نظر کو واضح اور قاطع انداز میں بیان کرتے تھے؛ مثلا ایک جگہ آپ فرماتے ہیں:" کسی بھی طاقت سے ہماری موافقت اور سازباز نہیں ہوسکتی، نہ تو ہم امریکا کا تسلط برداشت کریں گے اور نہ ہی روس کا ۔(ایضا، ج ١٥/ص/ ٢٠٩)

اور آخر میں اسلامی ممالک کے دوسرے ممالک سے تعلقات میں فعال سیاست کا ہونا بھی طاقت کے عوامل میں سے ہے۔مسلمان اتحاد کے ذریعہ بالخصوص غیر اسلامی ممالک سے تعلقات قائم کر کے اس بنیادی عنصر سےبخوبی فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

جو کچھ ذکر کیا گیا اس سے واضح ہوجاتا ہے کہ مختلف شعبوں میں تقریب طاقت وقدرت کے عوامل کو استحکام عطا کرتی ہے اور یہ طاقت عالم اسلام میں امن وسلامتی کی فضا قائم کرنے میں انتہائی کارساز ہے۔

تقریبی شعبوں اور امن کے شعبوں کا آپسی رابطہ

امن وسلامتی کے مختلف پہلو ہیں لہذا اسے مختلف شعبوں میں برقرار کرنے کی کوشش کرنا چاہئے۔مختلف میدانوں میں تقریب امن کے شعبوں میں بہتر طور پر امن وسلامتی فراہم کرنے میں معاون ہوتی ہے۔

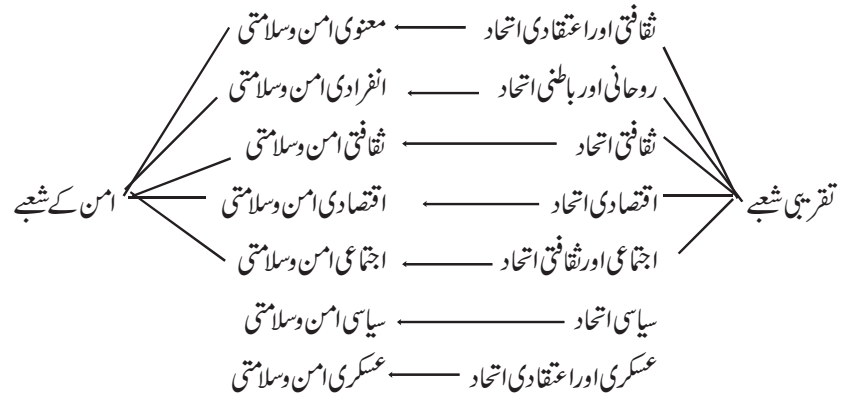

معنوی امن وسلامتی یعنی روحانی اور فکری شعبوں میں امن قائم ہونا۔اسلام میں اس شعبہ کو توحید پر عقیدہ اور قلبی ایمان کی صورت میں بیان کیا گیا ہے۔ثقافتی اور اعتقادی شعبوں میں اتحاد اس شعبہ میں امن وسلامتی فراہم کرسکتا ہے۔کیونکہ اس طرح مسلمان حقیقی اسلامی ثقافت تک رسائی حاصل کرلیں گے اور اسی کے زیر سایہ زندگی گذاریں گے۔

انفرادی شعبے میں امن، فرد کی جان، مال اور آبرو سے متعلق ہے، معنوی اور فکری شعبوں میں اتحاد یہ امن

فراہم کرسکتا ہے، کیونکہ اس شعبے میں اتحاد آپسی محبت اور حسن ظن پیدا کرتا ہے، جس سے جان، مال اور آبرو کی حفاظت میں آسانی ہوتی ہے۔ ثقافتی شعبے میں امن وسلامتی کا مطلب ہے حقیقی اسلامی شخصیت کی حفاظت کرنا اور مغربی ثقافت سے جو معمولا تکلفاتی اور مادی ہے اور مسلمانوں میں یہ خیال پیدا کرتی ہے کہ وہ اپنا ملک چلانے کی صلاحیت نہیں رکھتے ہیں لہٰذا اس سے مقابلہ کی قوت حاصل کرنا۔ مسلمان ثقافتی شعبے میں اتحاد کے ذریعہ مغربی ثقافت کا مقابلہ کرسکتے ہیں اور اپنی اسلامی ثقافت پر فخر ومباہات کے ذریعہ خود کو احساس بیچارگی وپستی سے نجات دے سکتے ہیں۔

امن کا چوتھا شعبہ اقتصاد ہے۔ افسوس کہ عہد حاضر میں زیادہ تر بالخصوص اسلامی ممالک کا اقتصاد مغرب سے وابستہ ہے اور انکے لئے اسکا نتیجہ غربت ومفلسی اور پسماندگی کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ مسلمان اقتصادی اتحاد اور مشترکہ اسلامی بازار قائم کرکے مغربی طاقتوں کے سامنے کہ جنکی لالچی نگاہیں اسلامی خزانوں پر لگی ہوئی ہیں، گداگری کے بجائے خود ایک دوسرے کی ضروریات پوری کرسکتے ہیں۔

اجتماعی امن وسلامتی کا مطلب قانونی اور جائز فعالیتوں میں آزادی، معاشریکا یکساں سہولیات سے فائدہ اٹھانا اور زبان، ثقافت اور مذہبی رسم ورواج کے مظاہر کا قائم ہونا ہے۔ (ربیعی، ۱۳۸۳، ص/۱۴۹) اجتماعی اور ثقافتی شعبوں میں اتحاد عالم اسلام کے لئے اس امن کو فراہم کرسکتا ہے کیونکہ معاشرے کے مختلف گروہوں (شیعہ اور اہلسنت) کے درمیان اتحاد اس بات کا سبب بنتا ہے کہ سبھی لوگ قانون کے مقابل یکساں حقوق کے مستحق ہوں اور آزادی کے ساتھ قانونی اور وجائز فعالیتوں میں حصہ لیں۔ امام خمینی کا ماننا تھا کہ ساری مذہبی اقلیتیں چاہے وہ یہودی ہوں، عیسائی ہوں یا زرتشتی؛ ان سب کو اپنے عقائد، نظریات اور مذہبی اعمال کی انجام دہی میں آزادی ہونی چاہئے شیعہ اور اہلسنت کا تو ذکر ہی کیا ہے: "اسلام میں ساری مذہبی اقلیتیں قابل احترام ہیں، انہیں اپنے مذہبی اعمال انجام دینے میں ہر طرح کی آزادی حاصل ہے۔ (صحیفہ امام، ج/۵، ص/۲۴۲)

''اسلام نے ہر طرح کے امتیازی سلوک کی مذمت کی ہے اور کسی بھی گروہ کو کوئی امتیاز نہیں دیا ہے۔ انسانوں کی عظمت کا معیار صرف تقوا اور اسلام پر عمل ہے"۔ (خمینی، ۱۳۷۱، ج/۱۰، ص/۱۹۷)

ثقافتی شعبہ میں اتحاد کے ذریعہ غیر ملکی ثقافتی یلغار کے مقابلہ میں میں زبان، ثقافت اور مذہبی رسم ورواج کی حفاظت کی جاسکتی ہے۔

سیاسی شعبے میں اتحاد بھی ضروری ہے۔ اس شعبہ میں افراد کو بھی مختلف سیاسی کارکردگیوں میں حصہ لینا چاہئے اور اسلامی ممالک کو بھی مغرب سے بے نیاز ہوکر اپنی مستقل سیاست اپنانی چاہئیں ان سے خوفزدہ ہوئے بغیر

اپنے فیصلوں کو واضح اور قاطع طور پر بیان کرنا چاہئے۔ سیاسی فعالیتوں میں لوگوں کی شرکت کا راستہ ہموار کرنے کے لئے اسلامی ممالک میں دینی حکومت کی تشکیل ہونی چاہئے۔ دینی حکومت، اسلام کے حیات آفریں نظام سے ماخوذ ہے اور الٰہی و توحیدی نظریہ اور آئیڈیالوجی کی بنیاد پر قائم ہوتی ہے، اس میں دینی احکام مجسم ہوتے ہیں اور درحقیقت یہ الٰہی نقطۂ نظر اور آئیڈیالوجی پر مبنی قانون سازی اور حکمرانی کا نظام ہے۔ (سعیدی شاہرودی، ۱۳۸۸، ص۲۲)

اس نظام میں مسلمان امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے اصول کی بنیاد پر اپنے معاشرے میں رونما ہونے والے تمام واقعات کی نگرانی کرتے ہیں۔

عسکری امن وسلامتی بھی خطروں کو کم کرنے اور اپنی طاقت اور صلاحیتوں میں اضافہ کا نام ہے۔) ربیعی، ایضا،ص (جیسا کہ امام خمینی نے فرمایا ہے عسکری اتحاد کے ذریعہ اسلامی ممالک کروڑوں فوجیوں پر مشتمل ایک لشکر بنا کر اپنی قدرت و طاقت میں اضافہ کر سکتے ہیں، مشترکہ فوجی مشق کر سکتے ہیں اور اس طرح مغرب کے سامنے اپنی طاقت کا مظاہرہ کر سکتے ہیں۔ اسی طرح اعتقادی شعبے میں اتحاد شیعہ اور اہلسنت کے درمیان داخلی جنگوں سے نجات کا سبب بن سکتا ہے۔

لہذا مختلف شعبوں میں تقریب، متعدد پہلوں کے حامل امن وامان کی فراہمی کو آسان بنا سکتی ہے۔

نتیجہ

اس تحقیق میں تقریبی عوامل، تقریبی شعبوں اور امن وسلامتی برقرار کرنے کے طریقوں پر گفتگو کے ذریعہ یہ واضح کیا گیا کہ اقتصادی، علمی، عسکری، سیاسی، ثقافتی اور اجتماعی شعبوں میں تقریب امن وسلامتی کا میدان ہموار کرتی ہے، کیونکہ جیسا کہ ذکر کیا گیا امن وسلامتی کا سب سے اہم عامل طاقت ہے۔ اور طاقت بھی امام خمینیؒ کی نگاہ میں صرف کسی خاص شعبہ کی تقویت مثلاً عسکری قدرت میں اضافہ سے مخصوص نہیں ہے بلکہ یہ داخلی و خارجی تعلقات کے پیچیدہ نظام میں عالم اسلام کی صورتحال کے بہتر ہونے سے حاصل ہوتی ہے۔ مثلا بیان کیا گیا کہ عالم اسلام میں طاقت کا ایک اہم عامل اقتصادی طاقت ہے۔ عالم اسلام اقتصادی شعبے میں اتحاد، علاقائی حدود سے ماورا اقتصادی اداروں کی پشت پناہی اور مشترکہ اسلامی بازار قائم کر کے قدرت کے اس عامل کی تقویت کر سکتا ہے جس کا نتیجہ عالم اسلام میں امن وامان کی فضا بحال ہونے کی صورت میں ظاہر ہوگا۔

اسی طرح سے مختلف شعبوں میں تقریب، معنوی، انفرادی، اقتصادی، اجتماعی، سیاسی اور عسکری شعبوں میں امن و

سلامتی فراہم ہونے کا باعث بنے گی۔لہذا یہ کہا جاسکتا ہے کہ تقریبی فکر عالم اسلام میں اتحاد قائم کر کے مسلمانوں کی طاقت وقدرت میں اضافہ کا باعث بنے گی اور امن وسلامتی کی صورتحال بہتر بنانے میں مددگار ثابت ہوگی۔

تجاویز

آخر میں چند تجاویز پیش کی جارہی ہیں جن پر عمل کر کے اسلامی ممالک کے سربراہ اور ان کے عوام تقریب کی راہ میں قدم آگے بڑھا سکتے ہیں اور اس طرح اپنی اور سارے مسلمانوں کی امن وسلامتی فراہم کر سکتے ہیں:

۱۔فقہا اور علمائے دین کو زمانے کے مسائل سے واقفیت حاصل کرنی چاہئے، عالم اسلام کی صورتحال سے لاتعلق نہیں رہنا چاہئے اور تقریب کے سلسلہ میں مختلف فتاوی دے کر اس راہ میں قدم آگے بڑھانا چاہئے۔

۲۔تعلیم یافتہ مسلمان، شیعہ ہوں یا اہلسنت، انہیں تعصب بالخصوص علمی تعصب سے پرہیز کرنا چاہئے، اور ایک دوسرے کی علمی تحقیقات سے مدد لے کر علمی ترقی کرنی چاہئے، اس طرح مغرب سے وابستگی ختم کرنی چاہئے۔اسی طرح مضامین، کتاب اور تقاریر کے ذریعہ لوگوں کو یہ سمجھانا چاہئے کہ سارے مذاہب کے ماننے والے انکی طرح سے مسلمان ہیں تاکہ وہ اختلاف سے دور رہیں۔

۳۔اساتذہ اور طلاب دونوں مذہبوں کے پیروکاروں کے ساتھ علمی نشستیں اور سوال وجواب کے مختلف جلسے منعقد کر کے اختلافی مسائل سے واقفیت حاصل کر سکتے ہیں اور دلیل کی بنیاد پر ان مسائل کے سلسلہ میں فیصلہ کر سکتے ہیں نہ یہ کہ بغیر کسی معلومات کے صرف تعصب کی بنیاد پر ایک دوسرے کے بارے میں باتیں کریں۔

۴۔ اسلامی ممالک کے سربراہ اختلاف کی جڑوں کی نشاندہی کر کے انہیں ختم کرنے کا اقدام کریں اور تقریب کا میدان ہموار کریں۔

۵۔ریڈیو اور ٹیلیویزن بھی ایسے پروگرام نشر کریں جو مسلمانوں کے درمیان سے دشمنی ختم کریں اور شیعہ و اہل سنت کے درمیان تقریب کی راہ ہموار کریں۔ریڈیو اور ٹیلیویزن تہذیب وثقافت بنانے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں اس لئے انہیں لوگوں کے سامنے اسلامی اور دینی ثقافت پیش کر کے مغرب کی ثقافتی یلغار کا مقابلہ کرنا چاہئے اور لوگوں کو مغربی ثقافت اپنانے اور اسلامی ثقافت سے دوری کے منفی نتائج سے واقف کرانا چاہئے۔

۶۔ میگزین، اخبار اور سارے ذرائع ابلاغ عامہ کو علمی اور استدلالی مضامین شائع کر کے، شکوک و شبہات زائل اور اختلافی مسائل کا حل پیش کرنا چاہئے۔

۷۔ اسلامی ممالک کے سربراہوں بلکہ پرائیوٹ اقتصادی شعبوں اور تاجروں کو خود کفیل ہونے اور مغرب سے وابستگی ختم کرنے کی کوشش کرنا چاہئے اور ایک دوسرے کی ضروریات پورا کرنے والا اقتصادی نظام قائم کرنا چاہئے، جسکے زیر سایہ عالم اسلام کو کمزور بنانے والی غربت و مفلسی، طبقاتی فاصلوں اور بے روزگاری وغیرہ کو ختم کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ اقتصادی کاوشوں میں سے ایک علاقائی حدود سے ماورا اقتصادی اداروں کی پشت پناہی اور مشترکہ اسلامی بازار قائم کرنا بھی ہے۔

۸۔ اسلامی ممالک کو کوشش کرنی چاہئے کہ وہ عالمی پیمانے پر یکساں عملی موقف اختیار کریں اور عالم اسلام کی مصلحت کو اپنی بلکہ اس سے بھی بدتر؛ مغرب کی مصلحتوں کی قربانی نہ بنائیں۔ عوام کو مشارکت کا حق دیں اور اسلامی ممالک میں قانونی سیاسی آزادی کو رواج دیں۔

۹۔ مسلمانوں کے دلوں میں اپنے دینی بھائیوں کے لئے احساس ہمدردی ہونا چاہئے، ان کے درد اور ان کی مشکلات کو اپنا درد اور اپنی مشکل سمجھنا چاہئے، ہمیشہ ایک دوسرے کی مدد کرنے کی کوشش کرنا چاہئے اور خدا پر توکل کر کے اپنے اندر صبر اور قوت برداشت میں اضافہ کرنا چاہئے۔

۱۰۔ اسلامی ممالک کو عالم اسلام کی یونیورسٹیوں کے تعاون سے علمی اور تکنیکی تحریک کو عملی جامہ پہنانے کے لئے، بین الاقوامی یونیورسٹی کی بنیاد ڈالنے کی کوشش کرنا چاہئے۔

۱۱۔ اسلامی ممالک کو عالمی پیمانے پر اطلاع رسانی اور پروپیگنڈہ کے ادارے بنانے چاہئیں۔

منابع

۱۔ قرآن کریم

۲۔ آصف محسنی، محمد، تقریب مذاہب از نظر تا عمل، نشر ادیان، قم ۱۳۸۶

۳۔ آصفی، محمد مہدی، طرح وحدت اسلامی، مجلّہ اندیشہ تقریب، ش ۱۲، ۱۳۸۶

۴۔ اخوان کاظمی، بہرام، امنیت در نظام سیاسی اسلام، کانون اندیشہ جوان، تہران، ۱۳۸۵

۵۔ افتخاری، اصغر، اقتدار ملی، جامعہ شناسی قدرت از دیدگاہ امام خمینی، سازمان عقیدتی سیاسی نیروی انتظامی، تہران، پہلی اشاعت، ۱۳۸۰

۶۔ خسروشاہی، سید ہادی، میز گرد تقریب بین مذاہب اسلامی، کلبہ شروق، مرکز بررسی ھای اسلامی، قم، ۱۳۸۱

۷۔خمینی، روح اللہ، استفتائات، دفتر انتشارات اسلامی، قم، ج، ۱۳۶۶
۸۔..... جہان اسلام از دیدگاہ امام، موسسہ تنظیم ونشر آثار امام، تہران، ۱۳۷۸
۹۔ ..... حکومت اسلامی، آزادی
۱۰۔..... صحیفہ امام، موسسہ تنظیم ونشر آثار امام، تہران، دوسری اشاعت، ج ۱۴، ۱۷، ۱۸، ۲، ۱۳۸۹
۱۱۔ ..... صحیفہ نور، وزارت ثقافت وہدایت اسلامی، تہران، ج ۵، ۱۹، ۴، ۱۳۷۱
۱۲۔..... کلمات قصار، پندھا وحکمتھا، موسسہ تنظیم ونشر آثار امام، تہران، ۱۳۷۲
۱۳۔ ڈوئرٹی، جیمز اور فالٹزگریف، رابرٹ، نظریہ ھای متعارض در روابط بین الملل، ترجمہ علیرضا طیب ووحید بزرگی، قومس، تہران، پہلی اشاعت، ج ۲، ۱۳۷۲
۱۴۔دولور، ژاک، ہمنوازی تازہ اروپا، ترجمہ عباس آگاہی، وزارت خارجہ، تہران، ۱۳۷۱
۱۵۔ربیعی، علی، مطالعات امنیت ملی، وزارت خارجہ، تہران، ۱۳۸۳
۱۶۔رشندل، جلیل، امنیت ملی ونظام بین الملل، سمت، تہران، ۱۳۷۴
۱۷۔کاظمی، علی اصغر، روابط بین الملل در تئوری ودر عمل، قومس، تہران، ۱۳۷۲

صلح اور باہمی زندگی کی تہذیب

بسام الصباغ (شام کے محقق اور اہل قلم)
ترجمہ: سید احتشام عباس زیدی

خلاصہ:

صلح و آسائش ایسے بنیادی اصولوں میں سے ہے جن کے علمدار پیغمبر اسلامؐ رہے ہیں اور آپؐ اسے تمام انسانیت کے لئے تحفہ کے طور پر لائے تھے۔

محقق نے اس بات کو بیان کرتے ہوئے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہد کی جنگوں کا جائزہ لیا ہے اور متعدد قرآنی و روائی دلائل کے ذریعہ اس بات کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہ جنگیں صرف دفاعی پہلو رکھتی تھیں اور زیادہ تر جنگیں آپؐ پر تحمیل کی گئی تھیں، اس کے بعد محقق نے اسلامی معاشرہ میں مسالمت آمیز باہمی زندگی کے اصول و قواعد بیان کئے ہیں، اسی طرح آیات و روایات اور سیرت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی روشنی میں مسلمانوں کے غیر مسلمانوں کے ساتھ سلوک کا جائزہ لیا ہے اور اس کو صلح و باہمی زندگی کے پایوں کا استحکام، بردباری، انسانی روابط کی مضبوطی، دینی آزادی کا احترام، فردی حقوق کا احترام اور انسان کی کرامت و بزرگی میں قرار دیا ہے، اور آخر میں ہر طرح کی فرقہ وارانہ فتنہ انگیزی کو رد کرتے ہوئے اہل سنت اور شیعوں کے درمیان ائتلافی فقہ، مصلحتی فقہ اور تقریب و اتحاد کی فقہ کی ضرورت پر زور دیا ہے۔

کلیدی الفاظ

صلح کی تہذیب، مسالمت آمیز باہمی زندگی، انسانی کرامت و بزرگی، دینی آزادی، تقریب واتحاد۔

مقدمہ:

اسلام نے صلح وآسائش کو ایک بنیادی اصول بتایا ہے اور اس کی جڑیں مسلمانوں کے دلوں میں قرار دی ہیں نیز اسے ان کی زندگی کا حصہ قرار دیا ہے۔

اسلام کا نام ''سلام'' (صلح) لے لیا گیا ہے جو خداوند عالم کے ناموں میں سے ہے:

''**ھو اللہ الذی لا الہ الا ھو الملک القدوس السلام المومن المھیمن العزیز الجبار** ...'' (حشر/۲۳)

اور جنت کو بھی ''دارالسلام'' کہا گیا ہے:

''**لھم دارالسلام عند ربھم وھو ولیھم بما کانوا یعملون**'' (انعام/۱۲۷)

اس رسالت کو پہچانے والے یعنی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی پرچم صلح کے حامل ہیں کیوں کہ آپؐ پوری انسانیت کے لئے خیر اور ہدات کا پیغام لائے ہیں، جیسا کہ آپؐ خود فرماتے ہیں:

''**انی رحمۃ للعالمین**''

''میں عالمیں کے لئے رحمت ہوں'' (**المستدرک علی الصحیحین** نمبر۰۰ نقل از ''ابوہریرہ'' اور ''المقدمہ'' نمبر۵ نقل از ''ابوصالح'')

مسلمانوں کا ایک دوسرے کو سلام کرنا بھی کلمہ ''سلام'' (صلح) سے ہے، کیوں کہ یہی درود وسلام لوگوں کے آغاز پیدائش سے فرمان الٰہی کی شکل میں رائج تھا۔ روایت میں آیا ہے: ''جب خداوند عالم نے آدم کو پیدا کیا تو ان سے فرمایا: جاؤ ان فرشتوں کو سلام کرو اور سنو کہ وہ تمھارے جواب میں کیا کہتے ہیں کہ تمھارا اور تمھارے خاندان کا سلام یہی ہوگا۔ آدمؑ نے کہا ''السلام علیکم'' فرشتوں نے جواب دیا ''**السلام علیک و رحمۃ اللہ** ،انھوں نے سلام پر رحمت کا بھی اضافہ کیا'' (سنن الترمذی، ح نمبر ۳۳۶۸۔ صحیح ابن حبان، ح نمبر ۶۱۶۷)۔

لہٰذا مسلمانوں کا سلام دنیا وآخرت میں ''السلام'' ہے:

''**تحیتھم یوم یلقونہ سلام و اعد لھم اجرا کریما**'' (احزاب/۴۴)

بہت سے مسلمانوں کا نام بھی ''عبدالسلام'' ہے۔

رسول خداؐ کی جنگیں مقدسات کے دفاع کے لئے تھیں

حقیر کو اس بات کا یقین ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی مکہ کی تیرہ سالہ زندگی میں شب و روز اپنی قوم کو اسلام کی طرف حکمت اور نصیحت کے ذریعہ دعوت دی لیکن قریش نے پیغمبرؐ محبت اور پیغمبرؐ اسلام و ایمان کی دعوت کو رد کر دیا اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نیز ان کے کمزور اصحاب پر ہر طرح کی اذیت و آزار کو روا رکھا تا کہ مومنوں کو بت پرستی کی طرف واپس پلٹائیں اور جب وہ ایک مومن کو بھی اپنا دین چھوڑنے پر آمادہ نہ کر پائے تو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مال و منصب، طاقت اور ہر آرزو پوری کرنے کا لالچ دینے لگے، لیکن ان کو اس راہ میں بھی ناکامی ہوئی۔ ایسی صورت میں انھوں نے متفقہ طور سے انھیں اور ان کے تمام مسلمان ساتھیوں، بنی ہاشم و بنی عبدالمطلب کے تمام حامیوں کا بائیکاٹ کرنے کا فیصلہ کیا، شعب ابوطالب میں تقریباً تین سال تک ان کا محاصرہ کیا اور ہر طرح کی کھانے پینے کی چیزیں ان تک پہنچنے پر روک لگا دی۔ یہاں تک کہ وہ لوگ درختوں کی پتیاں اور پودے کھانے پر مجبور ہو گئے۔ یہ لوگ دوسروں سے ملاقات اور بات سے محروم کر دیئے گئے۔ اس پوری مدت میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے ساتھیوں کو صبر کی دعوت دیتے رہے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کے ساتھیوں نے ہر طرح کی اذیتیں تکلیفیں، محاصرہ اور بھوک پیاس برداشت کی اور ہمیشہ خدا سے یہ دعا کرتے تھے کہ ان کے درمیان ایسے شخص کو لے آئے جو خدا اور اس کے رسولؐ پر ایمان رکھتا ہو۔

زخمی و مجروح، سزا جھیلے اور توہین برداشت کئے ہوئے مسلمان پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں آتے اور پیغمبرؐ رحمت سے اجازت طلب کرتے تھے کہ ہم بھی اس کے جواب میں اسلحہ اٹھائیں لیکن آنحضرتؐ ان لوگوں کو صبر و تحمل کی تاکید فرماتے تھے۔ اس دور کی ''یاسر''، ''حبیب'' اور ''خباب''... کی داستانیں ہم تک پہنچی ہیں ... یہاں تک کہ قریش نے جناب یاسر کی بیوی ''سمیہ'' کو بھی قتل کر ڈالا، جس پر پیغمبرؐ نے فرمایا: ''اے خاندان یاسر صبر کرو کہ جنت تمھاری منتظر ہے'' (ہندی، نقل از عمار بن یاسر، ح نمبر ۳۵۶۸ اور ۳۷۳۷)۔

جب پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے اصحاب پر ہونے والی بے انتہا اذیتوں کا مشاہدہ فرمایا تو انھیں حبشہ کی طرف ہجرت کرنے کی اجازت دے دی، کیوں کہ وہاں ایک عادل عیسائی بادشاہ حکومت کرتا تھا جو کسی پر ظلم و ستم نہیں کرتا تھا۔ گویا مسلمان اپنی مکی زندگی کے دور میں یعنی مدینہ کی جانب ہجرت سے پہلے بھی جہاد کرتے رہے لیکن یہ جہاد تلوار کا جہاد نہیں تھا بلکہ نفس کا جہاد تھا اور اذیت و آزار اور رنج و مصائب کے مقابل صبر کا جہاد تھا، جو

وہ لوگ خدا کی راہ میں برداشت کر رہے تھے، خداوند عالم بھی اس سلسلہ میں فرماتا ہے:

''والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا وان اللہ لمع المحسنین ''(عنکبوت/۲)

ترجمہ:''اور جو لوگ ہماری راہ میں جہاد کرتے ہیں ہم انھیں اپنے راستوں کی طرف ہدایت دے دیتے ہیں اور بلاشبہ اللہ تو محسنوں کے ساتھ ہے''۔

ان کا جہاد اذیتوں کے مقابل صبر کا جہاد تھا، خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے:

''احسب الناس ان یترکوا ان یقولوا آمنا وھم لا یفتنون ''

''کیا لوگوں نے یہ گمان کر لیا ہے کہ ان کے یہ کہنے پر کہ ہم ایمان لائے انھیں چھوڑ دیا جائے گا اور ان کا امتحان نہیں لیا جائے گا''

یہ جہاد بھی لوگوں کو اسلام کی دعوت اور حکمت و منطق، نصیحت و خوش زبانی کے ذریعہ الٰہی رسالت کی تبلیغ اور قرآنی جہاد تھا جسے خود قرآن میں جہاد اکبر کہا گیا ہے:

''فلا تطع الکافرین وجاھدھم بہ جھاداً کبیراً''(فرقان/۵۲)

اس مرحلہ یعنی مکی دور میں ہدایت کی طرف دعوت قرآنی شیوہ یعنی منطق، نصیحت، صبر اور ہر طرح کی سختی اور تندی سے دور تھا:

''ادع الی سبیل ربک بالحکمۃ و الموعظۃ الحسنۃ و جادلھم بالتی ھی احسن ان ربک ھو اعلم بمن ضل عن سبیلہ وھو اعلم بالمھتدین ''(نحل/۱۲۵)

لوگوں کو اپنے پروردگار کی راہ کی طرف حکمت اور نیک نصیحت کے ذریعہ دعوت دیجئے اور ان سے بہترین روش کے ذریعہ بحث کیجئے۔ بلاشبہ آپ کا پروردگار اس شخص سے بخوبی آگاہ ہے جو گمراہ ہوا اور ہدایت پانے والوں سے بھی بخوبی واقف ہے۔

ان کا جہاد میٹھے لہجہ میں تھا:

''فبما رحمۃ من اللہ لنت لھم ولو کنت فظاً غلیظ القلب لانفضوا من حولک...''

''پس آپ خداوند عالم کی جانب سے رحمت کی بنا پر ان سے نرم روی اختیار کرتے ہیں اور اگر تند خو اور سنگدل ہوتے تو لوگ آپ کے اطراف سے دور ہو جاتے...(آل عمران/۱۵۹)

''وما ارسلناک الا رحمۃ للعالمین ''

''اور ہم نے آپؐ کو اسی لئے بھیجا کہ آپؐ عالمین کے لئے رحمت ہیں'' (انبیاء/۱۰۷)

مکہ کے دوران کا اسلام حکمت، موعظۂ حسنہ، صبر وتحمل ورنج ومصیبت کے ساتھ پھیلا کیوں کہ اسلام صلح و ''سلام'' کا دین ہے۔

اگر ہم پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مدینہ ک زندگی پر نگاہ ڈالیں تو ہمیں نظر آتا ہے کہ یہ مرحلہ جس میں اسلامی حکومت کی بنیاد پڑی اور دستور العمل نیز مسلمانوں کے باہمی میل جول اوران کے اہل ذمہ سے تعلقات کے قوانین تدوین کئے گئے تو اس دور میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کسی بھی جنگ وجدل میں مبتلا نہیں ہوئے ۔پہلی آیت جس میں مسلمانوں کو جنگ کی اجازت دی گئی اس وقت نازل ہوئی جب ان کے لئے اپنے اور اپنے مقدسات کا دفاع ضروری ہوگیا۔اس وقت ارشاد ہوا:''**اذن للذین یقاتلون بانهم ظلموا و ان الله علی نصرهم لقدیر** '' جن لوگوں پر جنگ تھوپی گئی انھیں جہاد کی اجازت دے دی گئی کیوں کہ وہ لوگ ستم زدہ ہیں اور بلا شبہ خداوند عالم ان کی نصرت ومدد کرنے پر قادر ہے'' (حج/۳۹)

محبت وصلح کے پیغمبرؐ نے اپنے مدینہ کے دس سالہ قیام کے دوران اسلام کے کینہ توز دشمنوں یعنی بت پرستوں، یہودیوں، حکومت روم و بیزانس کے خلاف مقاومت کی ۔اس عرصہ میں آنحضرت ۲۷ جنگوں (جن میں آپ خود موجود تھے)اور پچاس سے زیادہ ''سریوں'' جن میں آپ تشریف نہیں لے گئے تھے، سے روبرو ہوئے ۔آپ ان میں سے کسی ایک میں بھی جنگ شروع کرنے والے نہ تھے اور نہ آپؐ نے کسی پر چڑھائی کی تھی بلکہ یہ تمام معرکے دشمن کے حملوں یا امکانی حملوں کے جواب میں تھے۔

جنگ بدر مکہ میں مسلمانوں کے باقی ماندہ اموال واپس لانے کے لئے تھی جسے قریش نے مکمل جنگ میں تبدیل کردیا۔(جنگ احد مدینہ پر قریش کی لشکر کشی کے جواب میں تھی) جنگ ''بنی قینقاع'' مدینہ میں یہودیوں کی خیانت کے جواب میں تھی ۔جنگ ''بنی نضیر'' بھی یہودیوں کی خیانت اور فریب کاریوں کے سبب انجام پائی ۔غزوہ ''بنی مصطلق'' اس وجہ سے انجام پائی کہ دشمن نے مدینہ پر شب خون مارنے کا فیصلہ کرلیا تھا لہٰذا پیغمبرؐ اپنے بچاؤ کے لئے دشمن سے روبرو ہوئے ۔جنگ خندق یا احزاب میں بھی تمام قبائل عرب اکٹھا ہوگئے تھے اور یہودیوں کے بھڑکانے اور ان کی خیانت کے ذریعہ مدینہ پر قبضہ کا ارادہ رکھتے تھے کہ انھیں اس خندق سے روبرو ہونا پڑا جو مسلمانوں نے مدینہ کے اطراف میں کھود رکھی تھی ۔نتیجہ میں کفار (الٰہی ہزیمت ک شکار ہوکے)واپس ہوگئے ۔غزوۂ احزاب کے بعد پیغمبرؐ اور آپؐ کے اصحاب ''بنی قریظہ'' کی طرف گئے جنھوں عہد وپیمان توڑا تھا۔غزوۂ ''حدیبیہ'' بھی پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مشرکوں کے درمیان صلح پر تمام ہوئی۔

خیبر کے یہودیوں نے بھی پیغمبرؐ کے ساتھ کئے ہوئے عہد و پیمان کو توڑا لہٰذا پیغمبرؐ ان سے جنگ کے لئے گئے تھے۔ ''جنگ موتہ'' بھی شام کی سرحدوں کے قریب رومیوں کی رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قتل کرنے کی کوشش اور رومیوں کی دو لاکھ کے لشکر کے ذریعہ مدینہ پر قبضہ کرنے کی تیاری کے جواب میں ہوئی۔ جس میں مسلمان اس آزار کو روکنے اور اپنے دفاع کے لئے نکلے ...اس کے بعد فتح مکہ پیش آئی جو قریش کی خیانت اور ان کے عہد و پیمان کو توڑنے کے سبب انجام پائی اور مکہ بغیر کسی خونریزی کے فتح ہو گیا۔ تاریخ بھی اس موقع پر پیغمبرؐ کی جانب سے صلح و محبت اور عظیم بخشش کی گواہ ہے جب کہ آپ نے قریش سے فرمایا: ''تم لوگ کیا سوچتے ہو میں تمھارے ساتھ کیا سلوک کروں گا؟ (قریش نے کہا) آپؐ ہمارے بڑے اور چچازاد بھائی ہیں تو آپؐ نے فرمایا: جاؤ تم سب آزاد ہو''۔ (سنن بیہقی، ح ۱۸۰۵۵/۹، البدایہ والنہایہ، ج ۴/ص ۳۰۱)

فتح مکہ کے بعد قبائل ''ہوازن'' اور ''ثقیف'' باہم متحد ہو گئے تا کہ پیغمبرؐ پر حملہ کریں۔ پیغمبرؐ بھی ان سے مقابلہ کے لئے نکلے اس طرح جنگ ''حنین'' پیش آئی۔ اس کے بعد اہل روم شام کی سرحدوں پر مشرک عرب قبائل سے مل کر ''تبوک'' کے علاقہ میں مسلمانوں پر حملہ کے لئے اکٹھا ہوئے تو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کے اصحاب گرمی کے موسم میں ان سے مقابلہ کو نکلے۔

اسی طرح زیادہ تر جنگیں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر تھوپی گئیں۔ آپؐ خود جنگ شروع کرنے والے نہیں تھے۔ آپؐ کی ہمیشہ یہ کوشش رہتی تھی کہ کشت و خون نہ ہونے پائے۔ آپ پیغمبرؐ رحمت تھے لیکن جب آپؐ پر جنگ تھوپی جاتی تھی تو شجاعت و دلیری کے پیغمبرؐ ہو جاتے تھے اور پوری طاقت کے ساتھ اپنی رسالت کا دفاع کرتے تھے۔ جیسا کہ تاریخ میں ''گوستاولوبون'' کا جملہ مشہور ہے ''تاریخ نے عربوں جیسے مہربان فاتح نہیں دیکھے ہیں'' (جادالمولی، ج ۱/ص ۸۳)

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جنگوں پر ایک ذرا توجہ کرنے کے بعد معلوم ہو جاتا ہے کہ اگر جنگ ہوتی بھی تھی تو طرفین میں مقتولین کی تعداد ہزار نفر سے زیادہ نہیں ہوتی تھی۔ پیغمبرؐ کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ بیماری کو ختم کریں نہ کہ بیمار کو۔ محققین امت کا اعتقاد ہے کہ جہاد صرف محترم و مقدس چیزوں کے دفاع کے لئے قانونی بنا ہے۔ قرآنی آیات اور صحیح احادیث نبوی اس مدعا پر بہترین دلیل ہیں۔

مشرکوں کے سلسلہ میں کافی ہے کہ اس آیت دی جائے ''...**فان اعتزلوکم فلم یقاتلوکم و القوا الیکم السلم فما جعل اللہ لکم علیھم سبیلا** ... اگر انھوں نے تم سے کنارہ گیری اختیار کی، تم سے جنگ نہ کی اور تم سے صلح و سلامتی اختیار کی تو خداوند عالم نے تمھارے لئے ان پر تجاوز کی راہ نہیں کھولی ہے''۔ (نساء

۹۰/) کہ یہ آیت ان سے جنگ کی تحریم پر گواہ ہے ،لیکن بعد والی آیت دوسرے گروہ کی حالت بیان کرتی ہے:''...**فان لم یعتزلوکم و یلقوا الیکم السلم و یکفوا ایدیھم فخذوھم واقتلوھم حیث ثقفتموھم واولئکم جعلنا لکم علیھم سلطنا مبینا ..**''

.پس اگر وہ تم دور نہ ہوئے اور تم سے صلح نہ کی اور تم پر ظلم کرنے سے ہاتھ نہ روکا تو انھیں جہاں پاؤ پکڑ لو اور قتل کر دو اور ہم نے تمھیں ان پر کھلا ہوا غلبہ اور تسلط دیا ہے۔(نساء/۹۱)

اور جو لوگ مسلمانوں سے عہد و پیمان توڑتے ہیں ان کے لئے سورۂ توبہ میں آیا ہے:

''**فاذا انسلخ الاشھر الحرم فا قتلوا المشرکین حیث وجدتموھم و خذوھم واحصروھم واقعدوا لھم کل مرصد فان تابوا و اقاموا الصلوۃ و اتوا الزکاۃ فخلّوا سبیلھم ان اللہ غفور رحیم** '' اور جب حرام مہینے تمام ہو جائیں تو مشرکوں کو جہاں پاؤ قتل کر دو، انھیں گرفتار کرو اور گھیرے میں لے لو اور ہر کمین گاہ میں ان کی تاک میں بیٹھو، پس اگر انھوں نے توبہ کی ،نماز ادا کی اور زکات دی تو انھیں آزاد کر دو کہ بلاشبہ خداوند عالم بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے''۔(توبہ/۵)

اسلام ،سلام (صلح) کا دین

اسلام صلح کا دین ہے وہ ہرگز خونریزی نہیں چاہتا اور جنگ و نبرد کے روکے جانے کو پسند کرتا ہے:

''**ورد اللہ الذین کفروا بغیظھم لم ینالوا خیرا و کفی اللہ المومنین القتال و کان اللہ قویا عزیزا** ''

'' خداوند عالم نے کافروں کو ان کے کینہ و غیظ و غضب کے سبب بلا کسی کامیابی کے بے نیل و مرام واپس کر دیا اور خدا جنگ میں مومنین کے لئے کافی ہے اور بلاشبہ وہ قوی و عزیز ہے۔(احزاب/۲۵)

جب معرکہ حُدیبیہ قریش کے ساتھ صلح میں تبدیل ہو گیا تو خداوند عالم نے یہ آیت نازل فرمائی: ''**انا فتحنا لک فتحا مبینا** '' بلاشبہ ہم نے آپ کو (اے رسول) کھلی ہوئی کامیابی عطا کی۔(فتح/۱) نیز اسی مناسبت سے اسی سورہ میں ارشاد ہوتا ہے:

''**ھو الذی کف ایدیھم عنکم و ایدیکم عنھم ببطن مکۃ بعد ان اظفرکم علیھم و کان اللہ بما تعملون بصیرا** ''

''وہ وہی ہے جس نے تمھیں ان پر کامیابی عطا کرنے کے بعد ان کے ہاتھ کو تم سے اور تمھارے ہاتھ کو ان سے مکہ کے دل میں روک دیا ہے اور خداوند عالم جو تم کرتے ہو اس سے آگاہ و بینا ہے۔(فتح/۲۴)

اور ایک روایت میں آیا ہے کہ ''دشمن کو ہرگز دیکھنے کی آرزو نہ کرو اور خدا سے عافیت وسکون کی درخواست کرو اور اگر دشمن سے روبرو ہوئے تو صبر وتحمل اختیار کرو''(صحیح بخاری کتاب ''الجہاد والسیر''، ح نمبر ۲۷۴۴، صحیح مسلم کتاب ''الجہاد والسیر''، ح نمبر ۳۲۷۶)۔اسی طرح ایک دوسری حدیث میں آیا ہے: ''اللہ کے نزدیک بہترین نام ''عبداللہ'' و ''عبدالرحمٰن'' اور پست ترین نام ''حرب'' ''یعنی جنگ'' اور ''مرہ'' ہے کیوں کہ اسلام دین صلح وسلام ہے''۔(سنن ابوداؤد کتاب الادب ح نمبر ۴۹۵۰۔سنن ابن ماجہ کتاب الادب ح نمبر ۳۷۱۸ ومسند احمد، کتاب مسند المکثرین من الصحابہ، ح نمبر ۵۸۴۸)۔

اسلامی معاشرہ میں صلح اور باہمی زندگی

اسلام نے اس امر کے لئے اصول وقواعد بنائے ہیں اور لوگوں کو مسلمان اور غیر مسلمان میں تقسیم کر کے مسلمان کے مسلمان سے سلوک کو مہربانی محبت اور برادری پر استوار کیا ہے کہ وہ آپس میں دل سوز، مہربان ہوں اور محبت کے ساتھ رہیں۔اسلام نے اسلامی امت کے لئے حسب ذیل اصول بنائے ہیں:

۱۔ان سے کہا گیا ہے کہ سب اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامیں ''**واعتصموا بحبل الله جميعا و لا تفرقوا**''، تم سب اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑے رہو اور پراگندہ نہ ہو۔(آل عمران/۱۰۳)

۲۔انھیں اتحاد کا حکم دیا گیا ہے اور تفرقہ سے روکا گیا ہے۔

۳۔عبادات کو بھی خدا اور بندوں کے درمیان ربط اور دوسری طرف بندوں کے باہمی ربط کا ذریعہ قرار دیا کہ ان میں سے بیشتر عبادات لوگوں کے درمیان مہر ومحبت اور تمام مخلوق یعنی جانوروں، درختوں، دریاؤں، اور خشکی و غیرہ سے نیکی اور مہربانی سکھاتی ہیں۔

ماں باپ کے ساتھ نیکی، صلۂ رحم، پڑوسیوں کے ساتھ نیکی، کمزوروں کے ساتھ مہربانی، ضرورت مندوں کی ضرورتیں پوری کرنا، مشکل میں گھرے ہوئے لوگوں کی مشکلیں دور کرنا، نیکی اور تقوا میں باہمی تعاون، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر، ایک دوسرے کو نصیحت، نیکی کی تاکید، صبر کی تاکید، مہربانی کی تاکید، یتیموں کے ساتھ حسن سلوک، غریبوں کو کھانا کھلانا، ظلم وفساد کے مقابل صبر واستقامت، عمل زبان یا دل سے برائیوں کو دور کرنے کی کوشش یا ہر وہ نیک کام جو ایک مسلمان اللہ کے بندوں کے لئے انجام دے، مثلاً مسکرانا، مصافحہ کرنا، میٹھی بات کرنا، کسی کی

مشکل دور کرنا یا کسی کی راہ کی رکاوٹ دور کرنا، یہ سب کی سب چیزیں خدا کی عبادت شمار ہوتی ہیں۔

مسلمانوں کی رحمت و مہربانی ان کی تربیت کا حصہ ہے مثلاً قرآن کی تاکید کہ ہر سورہ کے آغاز میں اس آیت کی تکرار موجود ہے ''**بسم الله الرحمٰن الرحیم** ۔یعنی بخشنے والے اور مہربا خدا کے نام سے''۔قرآن کریم کے بہت سے سوروں میں ایسی آیتیں موجود ہیں جو خداوند عالم کی رحمت و بخشش کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔اسی طرح بہت سی حدیثیں جو رحمت و مہربانی ذکر کرتی ہیں اور بیان کرتی ہیں کہ خدا بندوں پر رحم و کرم کرنے والوں پر رحمت نازل کرتا ہے:''اہل زمین کے ساتھ رحم کرو تا کہ جو آسمانوں پر ہے تم پر رحم کرے''۔

اسلام لوگوں کے ساتھ اچھے اور با اخلاق برتاؤ پر توجہ دیتا ہے۔خداوند عالم نے پیغمبرؐ کی اس طرح ستائش کی ہے:''**وانک لعلی خلق عظیم** ،بلاشبہ آپ خلق عظیم پر فائز ہیں''(قلم/۴) نیز انبیاء و مرسلین کی رسالت اخلاق کو کامل کرنے کے لئے قرار دی گئی ہے:''**بعثت لاتمم مکارم الاخلاق** '' (مسند احمد، کتاب باقی مسند المکثرین، ح نمبر ۸۵۹۵) اور عبادات کو بھی حسن اخلاق سے مربوط کیا ہے مثلاً نماز:''**ان الصلوٰۃ تنھیٰ عن الفحشاء والمنکر**...نماز فحشاء اور برائیوں سے روکتی ہے(عنکبوت/۴۵)۔زکات:''**صدقة تطھرھم وتزکیھم بھا** . ..ان سے زکات لو کہ تم اس کے ذریعہ انھیں پاک و پاکیزہ کرتے ہو...(توبہ/۱۰۳) اور روزہ ''**لعلکم تتقون** ''،ممکن ہے کہ پرہیزگاری اختیار کرو(بقرہ/۱۸۳) اور حج'' **فلا رفث ولا فسوق ولا جدال فی الحج** ...اور حج میں بیوی سے ہمبستری، بدزبانی اور لڑائی جھگڑا روا نہیں ہے...''(بقرہ/۱۹۷)

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے:''جو شخص بیہودہ باتیں کرے اور اسے ترک نہ کرے تو خداوند عالم بھی اس کی ضرورت محسوس نہیں کرتا کہ اس کے کھانے پینے کا سامان فراہم کرے''(صحیح بخاری، کتاب الصوم، ح ۱۷۷۰۔سنن ترمذی، کتاب الصوم ح ۶۴۱۔سنن ابوداؤد کتاب الصوم، ح ۲۰۱۵)

قرآن نے مومنوں کی اس طرح توصیف کی ہے:

﴿ **قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ . الَّذِينَ هُمْ فِي صَلاَتِهِمْ خَاشِعُونَ . وَالَّذِينَ هُمْ عَنْ اللَّغْوِ مُعْرِضُونَ . وَالَّذِينَ هُمْ لِلزَّكَاةِ فَاعِلُونَ . وَالَّذِينَ هُمْ لِفُرُوجِهِمْ حَافِظُونَ . إِلاَّ عَلَى أَزْوَاجِهِمْ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ فَإِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُومِينَ . فَمَنْ ابْتَغَى وَرَاءَ ذَلِكَ فَأُوْلَئِكَ هُمْ الْعَادُونَ . وَالَّذِينَ هُمْ لِأَمَانَاتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُونَ** ﴾

''بلاشبہ مومنین کامیاب ہوئے، وہی جو اپنی نمازوں میں خشوع کرتے ہیں، وہی جو بیہودہ باتوں سے پرہیز کرتے

ہیں، وہی لوگ جو زکات دیتے ہیں، وہی جو دامن کی حفاظت کرتے ہیں سوائے اپنی بیویوں یا اپنی کنیزوں کے کہ اس طرح وہ قابل ملامت نہیں ہیں۔ پس جو لوگ اس سے آگے بڑھ جائیں وہ تجاوز کار ہیں اور وہی لوگ جو اپنی امانتوں اور عہد و پیمان کا پاس ولحاظ کرتے ہیں'' (مومنون/۸۔۱)

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی صلۂ رحم، پڑوسیوں کے ساتھ اچھے سلوک، مہمان نوازی اور اچھے اخلاق کی تاکید کی ہے:

''جو شخص اللہ اور روز قیامت پر ایمان رکھتا ہے اسے چاہئے کہ صلۂ رحم کرے۔ جو اللہ اور روز قیامت پر ایمان رکھتا ہے اسے پڑوسیوں کو ستانا نہیں چاہئے۔ جو اللہ اور روز قیامت پر ایمان رکھتا ہے اسے چاہئے کہ مہمان کا اکرام واحترام کرے، اور جو شخص اللہ اور روز قیامت پر ایمان رکھتا ہے اسے چاہئے کہ باتیں کم کرے یا خاموشی اختیار کرے۔'' (صحیح بخاری، کتاب الادب، ح ۵۶۷۳۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، ح ۶۷)

''مومن وہ ہے کہ لوگ اپنی جان و مال کے سلسلہ میں اس سے امان میں رہیں'' (سنن ترمذی، کتاب الایمان ح ۲۵۵۱۔ سنن نسائی، کتاب الایمان ح ۴۹۰۹۔ مسند الامام احمد، کتاب مسند المکثرین ح ۸۵۷۵)

''جو شخص سیر ہو اور اس کا پڑوسی بھوکا ہو اور وہ اس بات کو جانتا ہو تو گویا وہ مجھ پر ایمان نہیں لایا ہے'' (طبرانی نمبر ۱۳۰۲۵)

اسی طرح پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، اس عورت کے لئے جو نماز و روزہ بہت کرتی تھی اور صدقہ بہت دیتی تھی لیکن اپنے پڑوسی کو اذیت و تکلیف پہنچاتی تھی، فرمایا: ''وہ جہنم میں ہے'' اور ایک دوسری عورت کے بارے میں جو نماز و روزہ کم کرتی اور صدقہ کم دیتی تھی لیکن اپنے پڑوسی کو تکلیف نہیں پہنچاتی تھی، فرمایا: ''وہ جنت میں ہے'' (مسند احمد، ح نمبر ۹۶۷۳۔ صحیح ابن حبان نمبر ۵۷۶۴۔ الحاکم نمبر ۷۳۰۴) لہٰذا معاشرہ میں اخلاقی خوبیوں کو رائج کرنا دین کی بنیادوں میں سے اور صلح و باہمی زندگی کو مضبوط بنانے کے لئے ہے۔ ساتھ ہی اخلاقی برائیاں مثلاً دوسروں کو پریشان کرنا، غریبوں اور محتاجوں پر سختی کرنا اور تندخوئی و تکبر، ان چیزوں کی اسلام میں نفی کی گئی ہے۔ ''جس کے دل میں ذرا بھی تکبر و غرور ہوگا وہ جنت میں نہیں جائے گا''۔ (صحیح مسلم، کتاب الایمان ح نمبر ۱۳۱ سنن ترمذی، کتاب البر والصلہ عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ، نمبر ۱۹۲۲۔ سنن ابن ماجہ، کتاب المقدمہ نمبر ۵۸)

''یہی شر آدمی کے لئے بہت ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کی تحقیر و بے عزتی کرے'' (صحیح مسلم، کتاب البر والصلہ نمبر ۶۵۰۴ سنن ابوداؤد، کتاب الادب نمبر ۴۲۳۸۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الزھد نمبر ۴۲۰۳)۔

حدیث قدسی میں خدا کا ارشاد ہوتا ہے: ''میں شرک سے سب سے زیادہ بے نیاز ہوں، جو شخص کوئی کام

کرے اور دوسرے کو میرا شریک قرار دے تو وہ سب کا سب اسی کے لئے ہے۔ اے میرے بندو! میں نے ظلم کو اپنے اوپر حرام کیا ہے اور تم پر بھی اسے حرام کیا، پس ایک دوسرے پر ظلم نہ کرو''۔ (صحیح مسلم، کتاب البر والصلہ والآداب ح نمبر ۴۶۷۴۔ مسند احمد، کتاب مسند الانصار نمبر ۲۰۴۵۱)۔

''ایک دوسرے کے ساتھ (غلط) تعلقات میں فساد ہلاک کرنے والا ہے'' (سنن ترمذی، کتاب صفۃ القیامہ نمبر ۲۴۳۳۔ سنن ابوداؤد، کتاب الادب نمبر ۴۲۷۳۔ مسند احمد، کتاب من مسند القبائل نمبر ۲۶۲۳۶)۔

''جھوٹی گواہی خدائے عزوجل پر شرک کے برابر قرار دی گئی ہے'' (سنن ترمذی، کتاب الشہادات عن رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ) نمبر ۲۲۲۳۔ سنن ابوداؤد، کتاب الاقضیہ نمبر ۳۱۲۴۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الاحکام نمبر ۲۳۶۳۔ مسند احمد، کتاب مسند الشامیین نمبر ۱۶۹۴۳)۔

آن حضورؐ کا ارشاد ہے: ''ایک عورت جہنم میں داخل کی گئی اس لئے کہ اس نے ایک بلی کو مرتے دم تک قید میں رکھا تھا'' (صحیح بخاری، کتاب بدء الخلق نمبر ۳۰۷۱۔ صحیح مسلم، کتاب السلام نمبر ۴۱۶۰)

''کیا تم چاہتے ہو کہ تمھیں سب سے بڑے گناہ کے بارہ میں بتاؤں؟ خدا کا شرک کرنا، عاق والدین۔ اس کے بعد فرمایا: البتہ جھوٹی بات اور جھوٹی گواہی بھی ایسی ہی ہے''۔ (صحیح بخاری، کتاب الادب نمبر ۱۲۶)۔

''کوئی بھی راستہ میں لوٹنے والا (یا اپنوں سے ترک تعلق کرنے والا) جنت میں داخل نہیں ہوگا'' (گزشتہ حوالہ نمبر ۵۵۲۵۔ صحیح مسلم، کتاب البر والصلہ والادب نمبر ۴۶۳۶) [دراصل اس حدیث میں ''لا یدخل الجنۃ قاطع'' آیا ہے کہ فقط ''قاطع'' کو قطع رحم کرنے والا، صلہ رحم کے مقابل نیز راہزن تفسیر کیا گیا ہے۔ البتہ پہلی تفسیر زیادہ بہتر ہے۔]

''کوئی چغلی کرنے والا (نمام) جنت میں داخل نہیں ہوگا'' (صحیح بخاری، کتاب الادب نمبر ۵۵۹۶۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان نمبر ۱۵۲)۔

''کوئی زنا کار زنا کرتے وقت مومن نہیں ہے، کوئی شرابی، شراب پیتے وقت مومن نہیں ہے، کوئی چور، چوری کرتے وقت مومن نہیں ہے''۔ (صحیح بخاری، کتاب المظالم نمبر ۲۲۴۳ وصحیح مسلم، کتاب الایمان/۵۷)۔

اسلام ''مقصد وسیلہ کی توجیہ کرتا ہے'' جیسے نظریہ کو قبول نہیں کرتا اور ہرگز اس کی اجازت نہیں دیتا کہ پست اور غیر اخلاقی وسائل کے ذریعہ بلند و بالا مقصد حاصل کیا جائے۔ اسلام یہ چاہتا ہے کہ پاک مقصد تک پہنچنے کے لئے پاک اور بہتر وسائل کا استعمال کرنا چاہئے۔ وہ ہرگز اس کی اجازت نہیں دیتا کہ انسان باطل کی راہ سے حق تک پہنچے۔ مثلاً رشوت، ربا یا سود یا احتکار کے ذریعہ مسجد بنائی جائے: ''خداوند عالم خود پاک ہے اور پاک کے علاوہ کسی چیز کو

پسند نہیں کرتا''۔(صحیح مسلم، کتاب الزکاۃ نمبر ۱۶۸۶۔سنن ترمذی، کتاب تفسیر القرآن عن رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نمبر ۲۹۱۵)۔

اسلامی امت، ایک اور یگانہ امت ہے''ان هذه امتكم امةواحدة وانا ربكم فاعبدون '' بلاشبہ یہ تمھاری امت ایک امت ہے اور میں تمھارا پروردگار ہوں، پس میری عبادت کرو''انبیاء/۹۲) امت میں یہ تنوع اور اختلافات اس کی غنا اور شکوفائی کو ظاہر کرتا ہے، اسے لڑائی جھگڑے اور ٹکراؤ میں تبدیل نہیں ہونا چاہئے۔ بڑے بڑے ہادیان دین ائتلاف واتفاق کی فقہ پر زور دیتے ہیں نہ کہ اختلاف کی فقہ پر۔ چاہے ہمارا نظریہ جدا ہی کیوں نہ ہو لیکن اہم یہ ہے کہ ہمارے دل ایک دوسرے سے نزدیک رہیں، اور پوری اسلامی امت ایک واحد ومتحد صف میں اپنے عہد کی مشکلات کے مقابل ڈٹ کر کھڑی ہو اور مل جل کر ان دشمنوں کی تاک میں رہے جو ہمارے خلاف تفرقہ پھیلانے اور سازشیں کرنے کی کوشش میں رہتے ہیں، خاص طور سے ایسے دشوار وقت میں جب دشمنوں نے اسلامی امت کو پارہ پارہ کر دیا ہے، ہماری زمینوں پر قبضہ کر رکھا ہے اور ہماری دولتوں کو لوٹ کر لے جا رہے ہیں۔

تاریخ میں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف کبھی ایسی اور اتنی سازشیں نہیں ہوئی تھیں۔ وہ لوگ اس امت کی جڑوں کو اکھاڑ پھینکنا چاہتے ہیں۔ ہماری تہذیب وثقافت، حیثیت، عقل ودماغ سب کچھ تباہ کرنا چاہتے ہیں۔ امریکا کا صدر کہتا ہے کہ اسلام ٹرورزم ہے۔ اسے ختم کر دینا چاہئے۔ وہ لوگ ہماری مسجدوں، ان کے میناروں ہمارے حج اور مکہ کے مدینی سفر، ہماری دینی تعلیمات، ہماری استقامت اور جان ومال وناموس سے متعلق ہمارے دفاع کو ٹرورزم کہتے ہیں۔ وہ ہمارے لئے نیا قرآن اور نیا دین لانا چاہتے ہیں تاکہ یہ کہہ سکیں کہ اسلامی امت کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے اور اسے ان کے تقاضوں اور ان کی سازشوں کے آگے تسلیم ہو جانا چاہئے۔

اسلامی اتحاد ہمیشہ پسندیدہ اور اولویت میں رہا ہے۔ ہمیں اپنے مشترکات میں تعاون کی بنیاد پر اتحاد قائم کرنے کے لئے اختلافی موارد میں باہم گفتگو کرنی چاہئے۔ مسلمانوں کے درمیان سازگار اور با مقصد گفتگو ہونی چاہئے، تاکہ نیکی اور تقوا کی راہ میں باہمی تعاون، مدد اور دوستی وبرادری کے زیر سایہ منطق وعلم کی روشنی میں نہ کہ بے جا شور وہنگاموں کے ماحول میں جو کچھ امت کے لئے خیر وصلاح ہو اس پر عمل کیا جائے۔

اس بات پر زور دینا چاہئے کہ مسلمانوں کہ درمیان باہم مسالمت آمیز زندگی کی اہم ترن اصل اور بنیادی شرط مسلمانوں کی برادری، ایک دوسرے پر تکیہ کرنا، باہم ایک دوسرے سے متعلق خوش گمانی برتنا، ایک دوسرے کی تکفیر وتفسیق نہ کرنا یعنی کافر یا فاسق نہ گردانا نیز ایک دوسرے کو گنہ گار شمار نہ کرنا ہے۔ جیسا کہ حدیث شریف میں بھی آیا ہے: ''جو شخص کسی کو کافر کہہ کر پکارے یا اسے خدا کا دشمن سمجھے اور حقیقت میں ایسا نہ ہو تو یہ حکم خود اس پر جاری ہوگا

''(صحیح مسلم، کتاب الایمان نمبر۶۰۔مسند احمد، کتاب مسند الانصار نمبر۲۰۴۹۲)

''اور اگر کوئی اپنے بھائی کو کہے: اے کافر! تو دو صورتوں میں سے ایک میں گرفتار ہوگا، اگر واقعی ایسا ہے تو خیر لیکن اگر ایسا نہیں ہے تو یہ خطاب خود اسی کی طرف پلٹ جائے گا۔(صحیح بخاری، کتاب الادب نمبر ۵۶۳۸۔صحیح مسلم، کتاب الایمان نمبر۹۲)۔

لہٰذا کسی بھی مسلمان کو فاسق کہنا، گنہ کار کہنا، اسے کافر کہنا ایسا گناہ ہے جو دین وعلم اور باہمی زندگی کے اصول کے بھی خلاف ہے۔امت میں تفرقہ کا باعث ہے اور اسلامی امت کے اتحاد کو نقصان پہنچاتا ہے۔آنحضرتؐ کا ارشاد ہے: ''میرے بعد کافروں کی صورت اختیار نہ کرنا جو ایک دوسرے کی گردن اڑاتے ہیں''(صحیح بخاری، کتاب العلم نمبر ۱۱۸۔صحیح مسلم گزشتہ حوالہ نمبر ۹۸)۔

''مسلمان، مسلمان کا بھائی ہے، اس پر ظلم نہیں کرتا اور اسے کسی کے حوالے نہیں کرتا''(صحیح بخاری، کتاب الاکراہ نمبر ۶۴۳۷۔صحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ والآداب نمبر ۴۶۷۷)۔

''مسلمان اپنے چھوٹے سے چھوٹے شخص کے ذمہ دار ہیں اور اپنے دور سے دور افراد کو بھی پناہ دیتے ہیں نیز دوسروں کے مقابل متحد اور ایک ہیں''سنن ابی داؤد، کتاب الجہاد نمبر ۲۳۷۱۔سنن ابن ماجہ، کتاب الدیات نمبر ۲۶۷۳ مسند احمد، کتاب مسند المکثرین نمبر ۶۵۰۶)۔

مسلمانوں کے درمیان اصلاح نیز مسلمان گروہوں اور خاندانوں کے درمیان سے تفرقہ کے اسباب کو دور کرنا بھی بہت عظیم عبادت کا درجہ رکھتا ہے۔خداوند عالم کا ارشاد گرامی ہے:

''**انما المومنون اخوہ فاصلحوا بین اخویکم**'' اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہ مومنین ایک دوسرے کے بھائی ہیں تو اپنے دو بھائیوں کے درمیان اصلاح اور صلح قائم کرو۔(حجرات/۱۰)

حدیث شریف میں آیا ہے: ''کیا تم لوگ چاہتے ہو کہ میں تمھیں نماز وروزہ اور صدقہ سے بھی بالاتر عمل سے باخبر کروں؟ لوگوں نے کہا ہاں (یا رسول اللہؐ) فرمایا: دو لوگوں کے درمیان اصلاح اور صلح قائم کرنا کیوں کہ مسلمانوں کے باہمی تعلقات میں ناراضگی اور فساد، ہلاک کرنے والا ہے''۔(سنن ترمذی، کتاب صفۃ القیامۃ والرقائق نمبر ۲۴۳۳۔مسند احمد، کتاب مسند القبائل نمبر ۲۶۳۶)۔

مسلمان بھائیوں کے درمیان اصلاح وآشتی اور برادری ہی کی وجہ سے اسلام نے ہمیں حکم دیا ہے کہ نرم خو، مہربان اور بخش دینے والے بنیں کیوں کہ یہی خصوصیتیں امن وسکون لاتی ہیں اور مسلمانوں کے درمیان اعتماد کی فضا برقرار کرتی ہیں۔خداوند عالم کا ارشاد ہے:

''**الکاظمین الغیظ والعافین عن الناس واللہ یحب المحسنین** '' وہ لوگ جو اپنے غصہ کو ضبط کرتے ہیں اور لوگوں کو معاف کر دیتے ہیں اور اللہ احسان کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔(آل عمران/۱۳۴)۔

نیز''...**فاصفح الصفح الجمیل** '' پس آپ ان لوگوں سے نیکی کے ساتھ درگزر کیجئے ۔(حجر/۸۵)

ہماری امت اس بات کی لیاقت وشائستگی رکھتی ہے کہ اپنے خدا کے فرمان پر توجہ دے اور اس پر عمل کرے کہ اس نے فرمایا ہے:''**واعتصموا بحبل اللہ جمیعا ولا تفرقوا** '' اور اللہ کی رسی کو پکڑے رہو اور پراگندہ نہ ہو۔(آل عمران/۱۰۳)

نیز''**ولا تکونوا کالذین تفرقوا واختلفوا من بعد ماجاء ھم البینات و اولئک لھم عذاب عظیم** '' اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جو متفرق و پراگندہ ہو گئے اور اس کے بعد بھی جب ان کے پاس کھلی ہوئی نشانیاں آئیں تو انھوں نے اختلاف کیا ایسے ہی لوگوں کے لئے عظیم عذاب ہے۔(آل عمران/۱۰۵)

نیز''...**ولا تنازعوا فتفشلوا وتذھب ریحکم واصبروا ان اللہ مع الصابرین** ...''

...اور باہم نزاع نہ کرو کہ سست ہو جاؤ گے اور تمھارا شکوہ وجلال ختم ہو جائے گا، اور صبر کرو کہ بلا شبہ خداوند عالم صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔(انفال/۴۶)

اسلامی نظام قضاوت پر ایک تحقیقی نظر

جواد حیدر ہاشمی (ریسرچ اسکالر کراچی یونیورسٹی شعبہ اسلامک لرننگ)

معاشرے میں عدالت اجتماعی کا قیام تمام صدیوں اور نسلوں میں انسانوں کی ایک ابدی آرزو اور خواہش رہی ہے اور تاریخِ انسانیت میں بہت کم ایسے دانشمند گزرے ہوں گے کہ جنہوں نے عدالت اجتماعی کے بارے میں بحث نہ کی ہو۔ تمام انسانوں خصوصاً سربراہان حکومت اس بات کے خواہاں رہے ہیں کہ معاشرے میں عدالت اجتماعی قائم ہو۔ لہٰذا ایک عادلانہ معاشرے کا قیام ایک ایسی آرزو ہے کہ ہر دور میں اکثر انسان اس کے تحقق کے لیے کوشاں رہے ہیں۔ انسانی تاریخ میں بہت سی جنگیں نیز حکومتوں میں اختلاف اور مختلف معاشروں میں سیاسی اور انقلابی تبدیلیاں معاشرے میں عدالت کے قیام اور عدالت کے توازن کو قائم یا برقرار کرنے کی غرض سے پیش آئی ہیں۔ لیکن ان سب کوششوں کے باوجود انسان کے سامنے یہ سوال اب بھی باقی ہے کہ کیا وہ ایک عادلانہ معاشرے کے قیام میں کامیابی حاصل کر سکے ہیں؟

عادلانہ معاشرے کا قیام صرف اسی صورت میں ممکن ہوسکتا ہے جب اس معاشرے کے اندر لوگوں کے لیے بنائے گئے اجتماعی قوانین عادلانہ ہوں، جن میں اس معاشرے کے تمام انسانوں کی ضروریات کا مکمل لحاظ رکھا گیا ہو۔ اور ان قوانین میں مختلف نسلوں، رنگوں اور مکاتب فکر سے تعلق رکھنے والے تمام انسانوں کے حقوق کا لحاظ رکھا گیا ہو۔ لہٰذا ایسے جامع قوانین بنانے والے شخص کے لئے ضروری ہے کہ وہ خود بھی جامع ذات کا حامل ہو اور ایسا

بے نیاز ہو کہ قوانین بناتے وقت اپنی خواہشات اور خودغرضی کو اس میں بالکل دخل نہ دے بلکہ تمام انسانوں کی ضروریات اور ان کے حقوق کا مکمل لحاظ رکھتے ہوئے جامع قوانین بنائے، اور ان خصوصیات کی حامل ذات فقط اللہ رب العزت کی ذات ہے جو لامتناہی علم کا مالک ہونے کے ناطے انسانوں کی تمام حاجات اور ضروریات کا علم رکھتا ہے، اور وہ ایسی بے نیاز مطلق ذات کا مالک ہے جو ہر طرح کی جانبداری اور خودغرضی سے مبرّا ہے۔ لہٰذا اس نے اپنے آخری نبی کے ذریعے اپنے آخری دین یعنی اسلام کی شکل میں ایسا جامع اور عادلانہ نظام انسانوں کے لئے بھیجا ہے جس کے قوانین کا سرچشمہ ذات الٰہی ہونے کی بناء پر وہ بنی نوع انسان کے لیے ہر طرح سے مفید اور موزوں ہے۔ کیونکہ اس نظام میں اللہ نے انسانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کی تمام ضروریات کا خیال رکھا ہے اور معاشرے میں انسان کے لیے ترقی کے جو بھی وسائل ممکن ہو سکتے ہیں، وہ فراہم کئے ہیں۔

دوسری طرف کسی بھی معاشرے کے اندر مکمل عدل وانصاف صرف اسی وقت فراہم ہو سکتا ہے جب اس معاشرے کے اندر عادلانہ قوانین کے ساتھ ساتھ مضبوط عدالتی نظام بھی قائم ہو جہاں ظالموں کو کیفر کردار تک پہنچایا جائے اور مظلوموں کو انصاف فراہم کیا جائے اور ان کے حقوق کا تحفظ کیا جائے۔

عدل وانصاف پر مبنی ایسا جامع عدالتی نظام یقیناً اسلامی نظام قضاوت ہی ہے کہ جس کا بنانے والا اللہ تعالیٰ ہے کہ جو اپنے لامتناہی علم کی بناء پر انسانوں کی تمام ضروریات کا علم رکھتا ہے اسی لیے اس نے اپنے بنائے ہوئے نظام قضاوت میں تمام انسانوں کے حقوق کا لحاظ رکھا ہے۔ قضاوت کی بحث میں تفصیلی غور کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ اس کا مفہوم واضح ہو۔ لہٰذا پہلے یہاں قضاء کے لغوی اور اصطلاحی مفاہیم کی تشریح پیش کی جاتی ہے:

قضاء کا لغوی معنی:

معجم تهذيب اللغة ، معجم مقاييس اللغة ، الموسوعة الفقهية اور **معجم الوسيط** کے مؤلفوں نے قضاء کا معنی ''حکم کرنا اور فیصلہ کرنا'' بیان کیا ہے۔

قضى: قضيا وقضا وقضيَّة: حكم و فصل ... القا ضى: القاطع للامور المحكم لها ومن يقضى بين النّاس بحكم الشرع. (۲)

قضی اپنے تینوں مصدروں کے ساتھ حکم کرنا اور فیصلے کرنا کے معنی میں آتا ہے۔۔۔اور قاضی وہ ہے جو امور کے بارے میں قاطع ہوتا ہے اوران کے بارے میں حکم کرتا ہے اور جو کہ شریعت کے حکم کے مطابق لوگوں کے درمیان فیصلے کرتا ہے۔

علامہ راغب اصفہانی نے مفردات الفاظ القرآن میں لکھا ہے:

القضاء: فصل الامر قولاً کان ذلک او فعلاً. (۳)

یعنی کسی کام کا فیصلہ کرنا چاہے وہ قولی ہو یا فعلی اسے قضاء کہتے ہیں۔

پس لغوی اعتبار سے قضاء کا معنی ''حکم لگانا اور فیصلے کرنا'' ہے۔

قضاء کا اصطلاحی معنی:

کتاب موسوعة مصطلحات جامع العلوم میں قضاء کے اصطلاحی معنی کے بارے میں لکھا ہے:

''انّ القضاء فی اصطلاح الفقهاء عبارة عن حکم القاضی عند المرافعة، یعنی اذا اختصم رجلان ثم القاضی حکم بالبیّنة والحجج الشرعیة بامر بینهما فهذا الحکم قضاء عندهم لا مطلق الحکم.'' (۴)

فقہاء کی اصطلاح میں قضاء قاضی کے اس حکم کو کہتے ہیں جو وہ لوگوں کے تنازعات کے فیصلے کے موقع دیتا ہے یعنی جب دو اشخاص میں تنازعہ پیدا ہو جائے اور پھر قاضی شرعی بیّنہ اور گواہوں کی بناء پر کسی امر کے بارے میں ان کے درمیان فیصلہ کرے تو قاضی کا یہ خاص حکم ان کے لئے قضاء کہلائے گا یہ مطلق حکم نہیں ہوگا۔

الموسوعة الفقهیة میں فقہ کے چار بڑے مسلکوں کی طرف سے قضاء کی تعریفیں بیان ہوئی ہیں:

والقضاء فی الاصطلاح: عرفه الحنفیة بأنه: فصل الخصومات وقطع المنازعات.

وعرفه المالکیة بأنه: الاخبار عن حکم شرعی علی سبیل الالزام.

و عرفه الشافعیة بأنه: الزام من له الزام بحکم الشرع.

و عرفة الحنابلة بانّه: تبيين الحكم الشرعي والالزام به و فصل الخصومات.(۵)

قضاء کی اصطلاحی تعریفیں:

حنفیہ نے اس کی یوں تعریف کی ہے: قضاء یعنی جھگڑوں کے فیصلے کرنا اور تنازعات کو ختم کرنا۔

مالکیوں نے یوں تعریف کی ہے: ایسے حکم شرعی کی ایسے خبر دینا جو الزام آور ہو۔

شافعیوں نے قضاء کی یوں تعریف کی ہے: حکم شرع کے مطابق وہ حکم کرنا جو لازم ہو۔

حنبلیوں نے قضاء کی تعریف یوں کی ہے: حکم شرعی کو بیان کرنا اور اس پر عمل کو لازمی قرار دینا اور جھگڑوں کے فیصلے کرنا۔

امام خمینی **تحریر الوسیلة** میں قضاء کی یوں تعریف کرتے ہیں:

"وهو الحكم بين النّاس لرفع التنازع بينهم بالشرائط ."(۶)

قضاء، لوگوں کے درمیان موجود تنازعات کو ختم کرنے کے لئے اپنے شرائط کے ساتھ حکم یا فیصلہ کرنا ہے۔

پس قضاء کے بارے میں بیان کردہ ان تمام تعریفوں سے جو نتیجہ نکلتا ہے وہ یہ ہے کہ مختلف تنازعات اور جھگڑوں کے بارے میں حکم شرع کے مطابق فیصلے کرنا قضاء کہلاتا ہے۔

عادلانہ معاشرے کے قیام کے لیے نظام قضاوت کی ضرورت

انسان ایک ایسا موجود ہے جو اجتماعی زندگی کا خواہاں ہے اور تنہا زندگی نہیں گزار سکتا بلکہ اس کی زندگی ایک دوسرے کے ساتھ مل کر ہی تشکیل پاتی ہے، اب جہاں اجتماعی زندگی کی بہت ساری خصوصیات ہیں وہاں ایک بڑی مشکل ہے وہ یہ کہ اجتماعی زندگی میں انسانوں کے مفادات کا آپس میں ٹکراؤ ہوتا ہے کیونکہ انسان کے اندر حرص، لالچ، تکبر، حب نفس، حسادت اور جہالت جیسی خصلتیں پیدا ہو جاتی ہیں، لہٰذا انہی خصائل کی بناء پر وہ اپنے پاس موجود چیزوں پر قانع نہیں ہوتا اور اپنی بے لگام نفسانی خواہشات کو پورا کرنے کی خاطر وہ دوسروں کے جہل اور کمزوری سے فائدہ اٹھا کر ان کے حقوق پر قبضہ کرتا ہے، اور انہیں اپنے ظلم و زیادتی کا نشانہ بناتا ہے۔ یہیں سے تنازعات اور کشمکش کا وجود عمل میں آتا ہے۔ اور یہ ایک طبیعی بات ہے کہ معاشرے کے اندر جتنی انسانوں کی تعداد

زیادہ ہواسی حساب سے باہمی تنازعات اور کشمکش بھی زیادہ ہوگی۔اب ان تنازعات کے موقع پر یہ تو نہیں ہوسکتا کہ آپس میں تنازعہ کرنے والے دونوں افراد حق پر ہوں بلکہ ان میں سے یقیناً ایک حق پر ہے جبکہ دوسرے نے اپنی حدود سے تجاوز کیا ہے جس کی بناء پر یہ تنازعہ پیش آیا ہے۔اس لئے ضروری ہے کہ معاشرے میں مخصوص شرائط کے ساتھ ایک قوّت ایسی موجود ہو جو ان مسائل کو حل کر سکے اور مفاسد کا راستہ روک سکے۔اور ہر حقدار کو اس کا حق یقینی طور پر مل جائے اور تجاوز اور دھونس دھاندلی کا راستہ بند کر کے لوگوں کے درمیان امن وآشتی کا ماحول پیدا کیا جا سکے۔کیونکہ اگر کسی بھی معاشرے میں امن وامان قائم نہ ہو تو وہ معاشرہ ترقی نہیں کر سکتا۔نا امنی کی وجہ سے اجتماعی نظم وضبط خراب ہو جاتا ہے جس سے لوگوں کی ذہنی یکسوئی ختم ہو جاتی ہے۔یہیں سے معاشرے کے اندر نظام قضاوت کی ضرورت سامنے آتی ہے۔

انسانوں کی زندگی میں اس نظام قضاوت کی ضرورت واہمیت کا اندازہ اسی سے لگایا جا سکتا ہے کہ نظام قضاوت سے کوئی بھی معاشرہ بے نیاز نہیں ہے اور اگر اس کے قوانین موجود نہ ہوں تو معاشرے کا ہر فرد اپنے مقصد اور حق کے حصول کے لئے یا طاقت اور قدرت کے استعمال پر مجبور ہوگا یا اسے اپنے حق سے دستبردار ہونا پڑے گا، نتیجتاً معاشرہ ظلم وستم کا شکار ہوگا اور کمزور افراد طاقتوروں کے ظلم وستم کا نشانہ بنیں گے اور اس صورت میں پھر کسی تہذیب یافتہ انسانی معاشرے اور سوسائٹی کا وجود باقی نہ رہے گا۔لاقانونیت اور برائی عام ہوگی اور پھر جنگل کے قانون کی طرح جس کا جتنا زور ہوگا اسی اعتبار سے وہ مختلف چیزوں کا حقدار بن جائے گا، پھر اس معاشرے میں پیدا ہونے والے جرائم اور لاقانونیت کا راستہ روکنا ناممکن ہوگا۔

اگر معاشرے میں کوئی مضبوط عدالتی نظام موجود نہ ہو تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ اس معاشرے میں ظلم و فساد رواج پائیں گے اور لوگوں کے حقوق پامال ہوں گے اور حکومتوں کی بنیادیں کمزور ہو جائیں گی اور بعید نہیں کہ ایسی صورت حال پورے نظام اور پوری ملّت کی سرنگونی اور انہدام کا باعث بن جائے۔لہٰذا ضروری ہے کہ ظلم و نا انصافی کی روک تھام اور لوگوں کے حقوق کے تحفظ کے لیے ہر معاشرے میں ایک عادلانہ نظام قضاء موجود ہو جہاں سے تمام لوگوں کو مکمل انصاف فراہم ہو سکے۔

اسلام میں قضاوت کی اہمیت

اسلام چونکہ ایک جامع دین ہے لہٰذا انسانی زندگی کے تمام امور اور مسائل سے متعلق قوانین اور احکام اس دین مبین میں موجود ہیں۔ اسلامی قوانین میں موجود انہی اہم احکام اور مسائل میں سے ایک اہم مسئلہ نظام قضاوت ہے جو اہم ترین فقہی اور اجتماعی امور میں سے ایک ہے، بلکہ اسلام کے بیان کردہ قوانین کا ایک اہم ترین رکن ہے کیونکہ معاشرے میں عدالت اجتماعی کا قیام اور لوگوں کے جان، مال اور عزت و آبرو کی حفاظت اسی پر موقوف ہے۔ اس اعتبار سے اگرچہ مسئلہ قضاوت کی اہمیت صرف اسلام اور مسلمانوں کی حد تک ہی منحصر نہیں ہے بلکہ تمام ادیان اور معاشرے کے نزدیک اس کی اہمیت مسلم ہے، لیکن اسلام نے اس مسئلہ پر خاص توجہ دی ہے، اور اسے انتہائی حساس پر خطر منصب قرار دیا ہے۔ لہٰذا اس کی مذمت اور ستائش میں بہت ساری روایات وارد ہوئی ہیں کہ جن میں سے ہر روایت یقیناً اس کی اہمیت پر دلالت کرتی ہے۔ یہاں ان میں سے فقط بعض روایات یہاں پیش کی جاتی ہیں:

۱۔ پیغمبر اکرمؐ نے قضاوت کے معاملے کو اس قدر خطرناک قرار دیا ہے کہ اس کو خودکشی کے مترادف گردانا ہے۔ آپ نے فرمایا:

"من ولی القضاء فقد ذبح نفسه بغیر سکّین." (۷)

جس نے اپنے آپ کو قضاوۃ کے منصب پر رکھا اس نے بغیر چھری کے اپنے آپ کو کاٹ ڈالا۔

۲۔ آپؐ نے مزید فرمایا:

"ولیأتیّن علی القاضی العدل یوم القیامة ساعة یتمنّی انّه لم یقض بین الاثنین فی تمرة قطُّ." (۸)

عادل قاضی پر قیامت کے دن ایک ایسا وقت آئے گا جب وہ آرزو کرے گا کہ اے کاش دو آدمیوں کے درمیان ایک خرما کی بابت بھی قضاوت نہ کی ہوتی۔

۳۔ حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

"شرُّ القُضاة من جارت قضيته."(۹)

قاضیوں میں سے بدترین قاضی وہ ہے کہ جس کے فیصلے ظلم پر مبنی ہوں۔

۴۔حضرت رسول اکرمؐ نے ایک حدیث میں فرمایا ہے کہ اللہ کے فرشتے عادل قاضی کی رہنمائی کرتے ہیں:

"اذا جلس القاضی فی مکانه هَبَطَ علیه مَلَکان یُسدِّدانه و یوفِّقانه ، و یُرشِدانه ما لم یجُر ، فاذا جار عَرَجا وتَرَکاه."(۱۰)

جب قاضی مختلف نزاعات کا فیصلہ کرنے کے لیے مسند قضاوت پر بیٹھتا ہے تو دو فرشتے اس پر نازل ہوتے ہیں اور اس وقت تک اس کی مدد اور رہنمائی کرتے ہیں جب تک وہ ظلم نہ کرے، جب ظلم کرتا ہے تو وہ اسے چھوڑ کر دوبارہ آسمانوں کی طرف پلٹ جاتے ہیں۔

۵۔حضرت علیؑ نہج البلاغہ میں پیغمبر اسلامؐ کا قول نقل کرتے ہیں:

"صلاح ذات البَین افضل من عامّة الصلاٰة و الصّیام."(۱۱)

لوگوں کے درمیان مصالحت تمام نمازوں اور روزوں سے افضل ہے۔

۶۔امام جعفر صادق علیہ السلام کا قول ہے:

"افضل الخلق اقضاهم بالحق."(۱۲)

خلق خدا میں بہترین وہ لوگ ہیں جو حق پر مبنی فیصلے کرتے ہیں۔

کیا ان روایات میں تعارض اور ٹکراؤ ہے؟

بظاہر ان روایات میں تعارض نظر آتا ہے اور ایک دوسرے سے مخالف نظر آتی ہیں، لیکن ذرا سے غور و فکر کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ حقیقت میں ایسا نہیں ہے جو روایات مذمت پر دلالت کرتی ہیں وہ ان افراد سے مربوط ہیں جو قضاوت کے منصب کے اہل اور سزاوار نہیں ہیں۔کم علم ہیں یا بد دیانت ہیں۔اپنی خواہشات پر قابو نہیں

رکھ سکتے ،خوف یا لالچ کے تحت کام کرتے ہیں اور لوگوں کے حقوق ضائع کرتے ہیں۔ یا وہ لوگ ہیں جو منصب قضاوت کے لئے اہلیت وصلاحیت تو رکھتے ہیں لیکن معاملات میں پوری دِقّت اور احتیاط سے کام نہیں لیتے۔

لیکن وہ روایات جو قضاوت کے معاملے میں ستائش اور تعریف پر مبنی ہیں ان افراد سے مربوط ہیں جو ایک طرف تو شرائط اور معیار قضاوت پر پورے اترتے ہیں اور دوسری طرف احکامِ الٰہی میں پوری طرح احتیاط سے کام لیتے ہیں۔

جیسے کہ شیخ طوسی **المبسوط** میں بیان کرتے ہیں:

''ان روایات کے درمیان جمع اس طرح ہے کہ وہ لوگ جو قضاوت کا علم رکھتے ہیں اور حق کے ساتھ قضاوت کرتے ہیں وہ درست راہ پر ہیں اور جو قضاوت کا علم تو رکھتے ہوں اور حقّ پر مبنی فیصلے نہ کرتے ہوں یا جاہل ہوں تو ان کے لئے اصلاً قضاوت جائز نہیں ہے اور اگر قضاوت انجام دیں تو وہ گنہگار ہیں۔'' (۱۳)

الموسوعة الفقهية میں اس بابت لکھا ہے:

''بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ احادیث میں جہاں بھی قضاوت کے بارے میں خوف دلایا گیا ہے اور وعید دی گئی ہے وہ فقط ظالم قاضیوں کے بارے میں ہے اور ان جاہل لوگوں کے بارے میں ہے جو علم کے نہ ہوتے ہوئے بھی اپنے آپ کو اس منصب میں داخل کر لیتے ہیں۔ اور پیغمبر اکرمؐ کا یہ قول جس میں فرمایا گیا ہے کہ جس نے اپنے آپ کو قضاوت کے منصب پر رکھا اس نے خود کو بغیر چھری کے ذبح کر دیا، بعض اہل علم کا نظریہ ہے کہ یہ حدیث قضاوت کے منصب کے شرف اور اس کی بلند منزلت کی دلیل ہے اور قضاوت کو انجام دینے والا گویا کہ اپنے نفس اور خواہشات کے ساتھ جہاد کرنے والا ہے اور یہ حق کے ساتھ قضاوت کرنے والے کی فضیلت پر دلیل ہے۔ چونکہ اس نے اپنے آپ کو بطور امتحان حق کی راہ میں ذبیح قرار دیا ہے۔ لہٰذا اس کے لیے بطور امتنان بہت بڑا ثواب قرار دیا گیا ہے۔ قاضی چونکہ اللہ کے حکم کو تسلیم کرتا ہے اور مختلف نزاعوں میں عزیز و اقارب کی مخالفت پر صبر کرتا ہے لہٰذا اسے اللہ کی طرف سے کوئی ملامت نہیں ہے یہاں تک کہ وہ ان کو امر حق اور کلمہ حق کی طرف لاتا ہے اور ان کو خواہشات کی پیروی اور دشمنی سے روکتا ہے گویا خود کو اللہ کے لئے ذبیح حق قرار دیتا ہے اور اللہ اسے ان شہداء کی

منزل پر لے جاتا ہے کہ جن کے لئے جنّت ہے پس شریعت میں قضاوت کے بارے میں جو مذمّت وارد ہوئی ہے وہ درحقیقت ظلم کی مذمّت ہے نہ کہ قضاوت کی۔'' (۱۴)

پس قضاوت ایک انتہائی گراں ذمہ داری ہے اور اس کو قبول کرنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہے اور اگر ایسے لوگ اس منصب کو قبول کر بیٹھیں جو قضاوت کی صلاحیت نہیں رکھتے تو انہوں نے نہ فقط بدترین گناہ کا ارتکاب کیا ہے، بلکہ حقیقت میں اپنے آپ کو ہلاکت کی بھینٹ چڑھا دیا ہے، لہذا جن روایات میں بظاہر قضاوت کی ذمہ داری اٹھانے کی مذمت واقع ہوئی ہے اور اسے ہلاکت نفس کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے اس سے مراد وہ افراد ہیں جو قضاوت کی عظیم مسؤلیت کو انجام دینے کی صلاحیت اور شائستگی نہیں رکھتے ہیں کیوں کہ اگر ایسے افراد اس منصب پر بیٹھ کر لوگوں کے تنازعات کے بارے میں قضاوت انجام دینا شروع کریں تو وہ اپنی نااہلی کی بناء پر ناحق فیصلے کریں گے جس سے لوگوں کے حقوق ضائع ہو جائیں گے اور نتیجے میں ایسا معاشرہ ایک عادلانہ نظام سے عاری ہوگا جس کی بناء پر ممکن ہے کہ اس معاشرے کے اجتماعی نظام میں خلل واقع ہو اور ہرج مرج پیدا ہو جائے۔ پھر ایسی خطرناک صورت حال کے حقیقی مسؤول یقیناً وہی نا اہل قُضاۃ ہی ہوں گے جن کے ناحق فیصلوں کی وجہ سے معاشرے میں یہ ہرج مرج پیدا ہوا۔ اسی لیے روایات میں قضاوت کی اس خطیر مسؤلیت کے حقدار فقط شائستہ افراد کو قرار دیا گیا ہے کہ جن کے اندر اس ذمہ داری کو انجام دینے کے تمام شرائط پائے جاتے ہوں، تاکہ لوگ ایسے قاضیوں کی طرف رجوع کر کے اپنے جائز حقوق حاصل کر سکیں کیونکہ لوگ قاضیوں کی طرف رجوع ہی اس لیے کرتے ہیں تاکہ اپنے حقوق کو ثابت کریں اور اپنے تنازعات کا خاتمہ کریں، لیکن خدانخواستہ اگر خود قاضی ہی نا اہل ہو یا اس میں مطلوبہ شرائط نہ پائے جاتے ہوں تو ایسے قاضیوں کی طرف رجوع کرنے سے نہ حق حقدار تک پہنچ سکتا ہے اور نہ ہی تنازعات کا خاتمہ ہو سکتا ہے بلکہ اس کے برعکس ممکن ہے کہ اس قاضی کے ناحق فیصلے کی وجہ سے تنازعات کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو جائے۔

قاضی اور منصب قضاوت کی اسلام میں اس قدر اہمیت اور منزلت ہے کہ شاید ہی کوئی مقام اسلام میں اتنی اہمیت کا حامل ہو کیونکہ اس کا واسطہ براہ راست لوگوں کے جان، مال اور عزت و آبرو سے پڑتا ہے لہٰذا جتنی اہمیت اسلام کے اندر لوگوں کی جان، مال، اور عزت و آبرو کی ہے اتنی ہی اہمیت منصب قضاوت کی ہے۔ لہٰذا جو اس

خطیر منصب کا عہدہ دار ہوتا ہے اس کا مقام بھی اسلام میں بہت بلند ہے۔ مذکورہ بالا احادیث میں غور کرنے سے یہ مطلب بھی روشن ہو جاتا ہے کہ جیسے قاضی کا مقام اسلام میں بہت بلند ہے بالکل اسی طرح اگر کوئی اس منصب کے ساتھ خیانت کرے اور ناحق فیصلے کرے تو اس کا مقام اتنا ہی پست اور اس کے لئے سزا بھی اتنی ہی سنگین ہے۔ لہٰذا اس سے عہدہ برآ ہونا ہر کسی کا کام نہیں ہے بلکہ فقط وہی لوگ اس ذمہ داری کو انجام دے سکتے ہیں جن میں اس کو انجام دینے کی اہلیت پائی جاتی ہو۔

قضاوت ایک حق الٰہی ہے

اسلامی نظام قضاوت میں سب سے بڑا قاضی خود اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ چونکہ قضاوت کا عہدہ اور لوگوں کی جان، مال اور عزّت و ناموس پر حکومت کرنے کا حق حقوق اللہ میں شامل ہے، اور یہ وہ خصوصیات ہیں جو خداوند متعال کے لئے خاص ہیں۔ چونکہ اصل حکومت و ولایت صرف خدا کے لئے ہے اور کسی کو لوگوں کے معاملات میں دخل دینے کا حق نہیں ہے چاہے ان کے اختلافات کو حل اور ان کے جھگڑوں کو نمٹانے کے لئے ہو یا حدودِ الٰہی کو جاری کرنے کے لئے سوائے ان افراد کے جن کو خداوند سبحان نے خود یہ ذمہ داری سونپی ہو۔

قرآن کریم نے اس بارے میں فرمایا ہے:

۱. **ان الحکم الاّ للّٰہ یقصّ الحقّ وھو خیر الفاصلین.** (انعام ۶، آیت ۵۷)

حکومت نہیں ہے مگر خدا کے لئے وہ حق کے ساتھ حکم دیتا ہے اور وہ بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔

پس حقیقت میں فقط اللہ کا حکم اور فیصلہ اپنے بندوں پر نافذ ہے، لیکن اگر خود اللہ نے ہی یہ ذمہ داری اپنے بندوں میں سے بعض برگزیدہ افراد کو سونپی ہو تو ان کا حکم اور فیصلہ بھی لوگوں کے اوپر نافذ ہوگا۔ قرآن کریم اور روایات کی سند کے مطابق خدا نے یہ اہم ذمہ داری اپنے پیغمبروں کے سُپرد کی ہے۔ لہٰذا اللہ کے بعد انہی کی قضاوت صحیح اور نافذ ہے۔ ان کے بعد ان افراد کو یہ حق حاصل ہے جن کو پیغمبروں نے قضاوت کا اختیار دیا ہے جن میں بعض ناموں سے اور بعض علامات کے ذریعے مشخص ہیں جیسے وہ قضاۃ جو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں قضاوت کے عہدے پر مامور ہوتے تھے یا وہ فقہائے جامع الشرائط جو کُلّی اور عمومی طور پر اس اہم منصب پر فائز ہوتے ہیں فقط یہی لوگوں کے درمیان قضاوت کا حق رکھتے ہیں اور ان کی قضاوت صحیح اور نافذ ہے۔

قرآن کریم کی اور بہت سی آیتیں بھی اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ اللہ نے اپنے بعد قضاوت اور حکومت کی ذمہ داری اپنے انبیاء کے سپرد کی ہے۔

قرآن کریم میں اس بارے میں آیا ہے:

وما کان لمؤمن ولا مؤمنة اذا قضیٰ اللّٰه ورسوله ان یکون لهم الخیرة من امرهم، و من یعص اللّٰه و رسوله فقد ضلّ ضلالاً مبیناً
(احزاب ۳۳، آیت ۳۶)

اور کسی مومن مرد یا عورت کو اختیار نہیں ہے کہ جب خدا اور رسول کسی امر کے بارے میں فیصلہ کر دیں تو وہ بھی اپنے امر کے بارے میں صاحب اختیار بن جائے اور جو بھی خدا اور رسول کی نافرمانی کرے گا وہ بڑی کھلی ہوئی گمراہی میں مبتلا ہوگا۔

اس آیۂ شریفہ میں حکم قضا کو صرف خدا کے لئے اور اس کے بعد اس کے رسول کے لئے قرار دیا گیا ہے۔

یا داود انّا جعلناک خلیفةً فی الارض فاحکم بین الناس بالحق. (ص ۳۸، آیت ۲۶)

اے داؤد ہم نے تم کو زمین میں خلیفہ بنایا ہے پس لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلے کرو۔

اس آیت سے یہ ظاہر ہے کہ قضاوت حکومت کا حصّہ ہے اور یہ حق خدا نے حضرت داؤدؑ کو دیا جو پیغمبروں میں سے ہیں۔

قرآن پیغمبر اسلام سے خطاب کرتے ہوئے فرماتا ہے:

انّا انزلنا الیک الکتٰب بالحقّ لتحکم بین النّاس بما ارٰک اللّٰه ولا تکن للخائنین خصیماً. (نساء ۴، آیت ۱۰۵)

ہم نے اس کتاب کو حق کے ساتھ تمہاری طرف بھیجا تا کہ جو کچھ خدا نے تمہیں سکھایا ہے اس کے مطابق لوگوں کے درمیان فیصلے کرو اور ان لوگوں میں سے نہ ہو جاؤ کہ خائن لوگوں کی حمایت کرو۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے پیغمبر اکرمؐ کو اپنے بتائے ہوئے اصولوں کے مطابق لوگوں کے درمیان فیصلے کرنے کا حکم دیا ہے۔ اس سے بھی پتہ چلتا ہے کہ خدا نے یہ ذمہ داری اپنے بعد اپنے نبی کے سپرد کی ہے۔

پس ولایت قضاوت کے حق کا اصلی مالک اللہ تعالی کی ذات ہے کہ حقیقت میں کائنات کے تمام حقوق کی آخری ونہائی بازگشت اسی کی طرف ہے۔ پھر اللہ نے ہی اس قضاوت کے حق کو اپنے انبیاء اور اوصیاء کے سپرد کیا ہے تا کہ وہ اس زمین پر لوگوں کے مابین پیش آنے والے تنازعات کا فیصلہ اللہ کے بتائے ہوئے اصولوں اور قوانین کی روشنی میں کریں۔ پھر انبیاء نے اپنے بعد یہ ذمہ داری اپنے جانشینوں اور اوصیاء کے سپرد کی ہے۔ اور ان کی غیر موجودگی میں جامع الشرائط فقہاء کو یہ ولایت حاصل ہے۔

بہر حال قضاوت کی ذمہ داری کو چاہے نبی انجام دے یا نبی کا جانشین اور وصی انجام دے یا جامع الشرائط فقیہ، سب کی ذمہ داری ہے کہ وہ قضاوت کے تمام مراحل میں حکم الٰہی کو مدنظر رکھیں اور اللہ کے حکم کے مطابق قضاوت انجام دیں اور فیصلے کریں کیونکہ جو حکم الٰہی کے مطابق فیصلے نہ کرے گا اور ناحق فیصلے کرے گا قرآنی نص کے مطابق ایسا شخص کافر، ظالم اور فاسق ہے۔ جیسا کہ قرآن میں آیا ہے:

ومن لم یحکم بما انزل اللّٰہ فاولئک ھم الکافرون (مائدہ /۴۴)

اور جو اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کرے وہی کافر ہے۔

ومن لم یحکم بما انزل اللّٰہ فاولئک ھم الظلمون (مائدہ /۴۴)

اور جو اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کرے وہی ظالم ہے۔

ومن لم یحکم بما انزل اللّٰہ فاولئک ھم الفاسقون (مائدہ /۴۶)

اور جو اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کرے وہی فاسق ہے۔

قاضی کے شرائط

اگر کسی معاشرے میں صحیح قوانین موجود نہ ہوں یا ان پر صحیح عملدرآمد نہ ہو تو اس سے لوگوں کے انفرادی اور اجتماعی حقوق ضائع ہو جاتے ہیں اور یوں حکومت پر سے بھی ان کا اعتماد اور اطمینان ختم ہو جاتا ہے اسی طرح صحیح قوانین تو ہوں لیکن ان قوانین کو معاشرے میں نافذ اور جاری کرنے والے افراد نااہل ہوں یا ان میں مطلوبہ شرائط نہ پائے جاتے ہوں تو بھی فقط اچھے قوانین کا وجود اس معاشرے کے افراد کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتا، بلکہ ضروری ہے کہ کسی بھی اچھے قانون کو جاری کرنے والے افراد بھی اچھے ہوں تا کہ اس کے مثبت آثار ظاہر ہو سکیں۔ اس لئے

اسلامی معاشرے میں یہ بھی ضروری ہے کہ جو شخص قضاوت کی اہم مسئولیت کا عہدہ دار ہونا چاہتا ہے اسے ایسا ہونا چاہیے کہ جو قضاوت کے قوانین اور فقہی رموز سے مکمل طور پر آگاہی رکھتا ہو، احکام کے استنباط پر قدرت رکھتا ہو، مختلف موارد اور موضوعات کی شناخت پر تسلط کافی رکھتا ہو، اور قضاوت کے امور کو انجام دینے کی صلاحیت اور اہلیت رکھتا ہو۔

شیعہ سنی فقہ کی مختلف کتابوں میں باب قضا کے اندر فقہاء نے قاضی کے لیے جو شرائط بیان کیے ہیں وہ درج ذیل ہیں:

۱):۔ بلوغ

پہلی شرط یہ ہے کہ قاضی بالغ ہو۔ جو شخص منصب قضاوت پر بیٹھ کر لوگوں کے درمیان نزاعات کے فیصلے کرنا چاہتا ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ شرعاً بالغ ہو، یعنی پندرہ سال کامل ہو چکا ہو۔ چونکہ اسلام میں انسان کو مختلف احکام الٰہی کا مکلّف قرار پانے کے لیے بلوغ شرط ہے۔ اور قضاوت بھی ایک تکلیف یا حکم الٰہی ہے۔ شرعی دلیلوں سے ہٹ کر عقلائے عالم کے درمیان بھی یہ ایک مسلمہ عقلانی ضرورت ہے کہ وہ معاشرے میں کوئی بھی اہم ذمہ داری بچوں کو نہیں سونپتے۔

۳):۔ عقل

دوسری شرط یہ ہے کہ قاضی عاقل ہو۔ دنیا کے تمام عقلاء کے نزدیک یہ ایک مسلمہ بات ہے کہ جو شخص عقل نہیں رکھتا اس پر کسی قسم کی کوئی تکلیف یا ذمہ داری نہیں ہے۔ شرعی دلیلوں کے مطابق جو شخص عقل کی نعمت سے محروم ہو وہ نہ فقط منصب قضاوت کا عہدہ دار نہیں بن سکتا بلکہ اس سے تمام تکالیف الٰہی ساقط ہیں، اور وہ کسی قسم کے حکم شرعی کے بجالانے کا مکلّف نہیں ہے۔ بنابراین بچے، مجنون، پاگل، دیوانے وغیرہ لوگوں کے مابین قضاوت نہیں کر سکتے۔

۳):۔ اسلام

تیسری شرط یہ ہے کہ قاضی مسلمان ہو اور دل سے دین مبین اسلام کا ماننے والا ہو۔ چونکہ اسلام میں اس کی سرے سے کوئی گنجائش ہی نہیں ہے کہ کوئی غیر مسلم مسلمانوں کے مابین پیش آنے والے نزاعات کے بارے میں

فیصلے صادر کرے۔ کیونکہ اللہ مومنین کے اوپر کافروں کے کسی بھی قسم کے تسلط کو پسند نہیں فرماتا۔ ''لن یجعل اللہ للکافرین علی المؤمنین سبیلاً''۔ (نساء/۱۴۱)

۴):۔ عدالت

پانچویں شرط یہ ہے کہ قاضی عادل ہو۔ عدالت ایک ایسی صفت ہے کہ اسلامی شریعت میں بہت سی ذمہ داریاں صفت عدالت سے مشروط ہیں۔ جیسے امام جماعت، مجتہد، عدالتی گواہان وغیرہ۔

قاضی کے اندر صفت عدالت کے ضروری ہونے کے اوپر عقلی دلیل بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ چونکہ قاضی پر لازم ہے کہ وہ لوگوں کے درمیان پیش آنے والے جھگڑوں کے فیصلے عادلانہ طور پر کرے، لہٰذا اگر وہ خود عادل نہ ہو تو وہ ظالم ہے اور ظالم شخص آپس میں نزاع کرنے والے افراد کے درمیان یا مختلف اجتماعی مسائل کو برطرف کرنے کے لیے عادلانہ فیصلے نہیں کرسکتا۔

۵):۔ مرد ہونا

پانچویں شرط یہ ہے کہ قاضی مرد ہو۔

۶):۔ علم

چھٹی شرط یہ کہ قاضی عالم ہو۔ یعنی قاضی کے لیے ضروری ہے کہ وہ ان تمام طریقوں اور احکامات کا علم رکھتا ہو جو عادلانہ فیصلے کے لیے ضروری ہیں۔ قاضی کے لیے اس شرط کا مسلم ہونا بھی عقلی ہے۔ کیونکہ اگر کوئی بھی عاقل شخص لوگوں کے درمیان نزاعات کے فیصلے کرنے کے لیے منصب قضاوت پر بیٹھنا چاہتا ہے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ علم قضاوت کے تمام قواعد وضوابط اور اصولوں کا علم رکھتا ہو۔ اور جس شخص کے اندر قضاوت سے متعلق کوئی علم نہ ہو یا اس کا علم اس بارے میں کم ہو تو عقلاء اور عرف کی نظر میں ایسا شخص قاضی بننے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ لہٰذا قاضی کے لیے ضروری ہے کہ وہ قضاوت کے علم سے آشنا ہو۔

اب یہاں شرائط قضاء سے متعلق شیعہ سنی فقہاء کے آراء نقل کیے جاتے ہیں تاکہ معلوم ہو سکے کہ منصب قضاوت پر بیٹھنے کا اہل ہر شخص نہیں ہے بلکہ فقط وہی اشخاص اس مسؤلیت کو انجام دے سکتے ہیں جن میں مطلوبہ شرائط پائے جاتے ہوں۔

محقق حلی شرائع الاسلام میں قاضی کے شرائط بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''قاضی کے لیے ضروری ہے کہ وہ بالغ ہو، عاقل ہو، مومن ہو، عادل ہو، حلال زادہ ہو، عالم ہو اور مرد ہو۔''(۱۵)

شیخ مرتضیٰ انصاری اپنی کتاب القضا و الشهادات میں قاضی کے شرائط بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''قاضی میں جن شرائط کا ہونا ضروری ہے وہ یہ ہیں: بلوغ، عقل، عدالت، حلال زادہ ہونا اور قضاوت سے مربوط مسائل کے بارے میں علم جو اس نے متعارف دلیلوں یعنی قرآن، سنت اور عقل سے حاصل کیا ہو نہ کہ کسی بھی طریقے سے حاصل ہونے والا علم۔''(۱۶)

معروف علمائے کرام امام ماوردی اور ابو یعلی نے قاضی کے اندر سات شرطوں کو معتبر قرار دیا ہے۔

وہ لکھتے ہیں:

''قضاوت کا انجام دینا جائز نہیں ہے مگر اس شخص کے لیے جس میں اس کے شرائط پائے جاتے ہوں کہ جن شرائط کے ساتھ اس کی تقلید کرنا صحیح ہے اور اگر وہ کوئی فیصلہ کرے تو اس کا فیصلہ بھی نافذ ہے، اور وہ شرائط سات ہیں''

پہلی شرط یہ ہے کہ قاضی مرد ہو، اور یہ دو صفتوں کا مجموعہ ہے یعنی بلوغ اور مذکر ہونا۔

دوسری شرط کہ جس کے معتبر ہونے پر حکم عقل کے علاوہ علماء کا اجماع بھی ہے، یہ ہے کہ قاضی کے لیے ضروری ہے کہ وہ بدیہیات کا علم رکھتا ہو تا کہ صحیح چیزوں کی تمیز کر سکے، اور ضروری ہے کہ وہ سہو اور غفلت سے دور ہو اور اپنی ذہانت کے ذریعے مشکل چیزوں کی وضاحت کر سکتا ہو نیز مشکل مسائل کو حل اور فیصلہ کر سکتا ہو۔

تیسری شرط یہ ہے کہ قاضی آزاد ہو کیونکہ جو شخص کسی کا غلام ہو وہ خود اپنے اوپر اختیار نہیں رکھتا، اس لیے دوسرے کے اوپر بھی کوئی اختیار نہیں رکھتا۔

چوتھی شرط یہ ہے کہ قاضی مسلمان ہو، کیونکہ کسی کی گواہی اور شہادت کی قبولیت کے لیے بھی اسلام شرط ہے۔

پانچویں شرط یہ ہے کہ قاضی عادل ہو اور عدالت ایک ایسی صفت ہے کہ جو ہر قسم کی ولایت کے لیے شرط ہے۔ عدالت یہ کہ شخص سچ بولنے والا ہو، امانت کی رعایت کرنے والا ہو، محرمات سے پرہیز کرنے والا ہو، گناہوں سے بچنے والا ہو، شک سے دور ہو اور خوشی اور غصے کی حالت میں اپنے آپ پر کنٹرول رکھتا ہو۔

چھٹی شرط یہ ہے کہ قاضی سن سکتا ہو اور دیکھ سکتا ہو تا کہ حقوق کی صحیح نشاندہی کر سکے اور طالب اور مطلوب میں فرق کر سکے اور اقرار کرنے والے اور انکار کرنے والے کی صحیح تمیز کر سکے اور حق کو باطل سے تشخیص دے سکے۔

ساتویں شرط یہ ہے کہ قاضی شرعی احکام کے بارے میں علم رکھتا ہو (عالم ہو)۔'' (۱۷)

امام ابن رشد قرطبی قاضی کے شرائط بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''قاضی کے لیے قضاوت کے جواز میں جو شرائط معتبر ہیں وہ یہ ہیں کہ وہ آزاد ہو، مسلمان ہو، بالغ ہو، مرد ہو، عاقل ہو اور عادل ہو۔ اجتہاد کی شرط کے معتبر ہونے میں علماء کا اختلاف ہے امام شافعی نے کہا ہے کہ قاضی کا اہل اجتہاد میں سے ہونا ضروری ہے۔'' (۱۸)

کتاب **موسوعة الفقهية** میں اہل سنت کے چاروں مذاہب فقہیہ کے نزدیک قاضی کے شرائط بطور علیحدہ بیان کئے گئے ہیں جیسا کہ بیان ہوا ہے:

''حنفیوں کے نزدیک قضاوت وہ شخص کر سکتا ہے کہ جو مسلمانوں میں شہادت دینے کا اہل ہو اور شہادت کے شرائط یہ ہیں:

مسلمان ہو، عقل رکھتا ہو، بالغ ہو، آزاد ہو، دیکھ سکتا ہو، بول سکتا ہو، حد قذف سے سالم ہو۔۔۔ ان جملہ شرائط کے معتبر ہونے کی دلیل یہ ہے کہ قضاوت ولایت کے باب میں سے ہے بلکہ ولایتوں میں سب سے زیادہ اہم ہے۔ لہٰذا قاضی کے اندر ان شرائط کا پایا جانا ضروری ہے۔

حنبلیوں کے نزدیک قاضی کے لئے شرط ہے کہ وہ بالغ ہو، عاقل ہو، مرد ہو، آزاد ہو، مسلمان ہو، عادل ہو سننے دیکھنے اور بولنے کی صلاحیت رکھتا ہو، مجتہد ہو۔

شافعیوں کے نزدیک جو شرائط قاضی کے لئے ضروری ہیں وہ دس ہیں:

۱): مسلمان ہونا۔

۲):آزاد ہونا ۔

۳): مرد ہونا۔

۴): مکلّف ہونا۔

۵):عادل ہونا۔

۶): دیکھ سکتا ہو۔

۷):سن سکتا ہو۔

۸): بول سکتا ہو۔

۹): مجتہد ہو۔

۱۰): قضاوت کی لیاقت رکھتا ہو۔

مالکیوں کے نزدیک قاضی کی ولایت کے لئے چار شرطوں کا ہونا ضروری ہے:

۱۔قاضی عادل ہو، اور عدالت کا لازمہ یہ ہے کہ وہ دین اسلام پر ہو، بالغ ہو، عاقل ہو، آزاد ہو اور فاسق نہ ہو۔

۲۔قاضی مرد ہو۔

۳۔قاضی ذہین ہو یعنی کلام کے معانی کو درک کرنے کی قوت اور ذہنی صلاحیت رکھتا ہو۔

۴۔احکام شرعیہ کا عالم ہو۔

اور نیز ضروری ہے کہ قاضی سننے، دیکھنے اور بولنے کی صلاحیت رکھتا ہو، پس اندھے اور گونگے کے لئے قضاوت جائز نہیں ہے۔''(۱۹)

حضرت علی علیہ السلام نے جناب مالک اشتر کو جو خط لکھا ہے اس میں فرماتے ہیں کہ قضاوت کے لئے ایک ایسے شخص کو منتخب کرو جس میں یہ شرائط پائے جائیں:

''تیرے نزدیک رعایا میں سب سے افضل ہو، رجوع کرنے والوں کی کثرت سے تنگ نہ آتا ہو، مخالفوں کا رویہ اس کو ضد پر آمادہ نہ کرے، اپنی غلطی پر اصرار نہ کرتا ہو، حق کو پہچاننے کے بعد اس کی طرف رجوع کرنے سے دریغ نہ کرے، اس کا نفس لالچ میں گرفتار نہ ہو، مطلب کو سمجھنے کے لئے ذرا سی تحقیق پر اکتفا کرنے والا نہ ہو، شکوک وشبہات کے امور میں سب سے زیادہ توقف کرنے والا ہو، دلیل وحجت کے معاملات میں سب سے زیادہ برہان قبول کرنے والا ہو، شکایت کرنے والوں سے سب سے کم ناراحت ہونے والا ہو، معاملات کی چھان بین میں سب سے زیادہ صبر کرنے والا ہو، جب حکم واضح ہو جائے تو نہایت وضاحت سے فیصلہ کرتا ہو، تعریف اور ستائش کی وجہ سے تکبّر اور خود بینی میں مبتلا ہونے والا نہ ہو، زیادہ تعریف کی وجہ سے تعریف کرنے والے کی طرف مائل ہونے والا نہ ہو۔''

یہ حضرت علی علیہ السلام کی نگاہ میں قاضی کے صفات وشرائط ہیں۔ آخر میں فرماتے ہیں:

''و اُولٰئک قلیلٌ''(۲۰)

ان صفات اور شرائط کے حامل افراد بہت کم ہیں (لیکن ہیں)۔

قضاوت کا معاملہ چونکہ لوگوں کی جان، مال اور عزت وآبرو سے گہرا تعلق رکھتا ہے اس لئے ایک طرف تو دیگر اہم اجتماعی ذمہ داریوں کی طرح اس ذمہ داری کو اہل افراد کے سپرد کیا جانا چاہیے اور کسی صورت میں نااہل افراد کو اس منصب کے قریب جانے کی اجازت نہیں ملنی چاہیے، دوسری طرف جو لوگ اس کے اہل ہیں اور صلاحیت رکھتے ہیں ان کو اس منصب کے قبول کرنے سے انکار نہیں کرنا چاہیے۔ ایسا انکار بھی بہت بڑا گناہ اور اسلام اور مسلمین کے معاملات سے لاتعلقی کا اظہار ہے جو جائز نہیں ہے مگر یہ صرف اس شخص کے لئے ہے جو قاضی بننے کے شرائط کا حامل ہو۔

قضاوت کے آداب اور قاضی کی ذمہ داریاں

قضاوت کے آداب سے مراد یہ ہے کہ قاضی قضاوت کے دوران آداب قضاوت سے مربوط اسلامی نصوص میں وارد شدہ احکام کے لحاظ سے معاشرے میں عادلانہ قضاوت کی راہ ہموار کرے۔

دین مبین اسلام نے معاشرے میں لوگوں کو انصاف فراہم کرنے کے لیے اپنے نظام قضاوت کے اصولوں میں جس دقت اور باریک بینی سے کام لیا ہے وہ انتہائی بے نظیر ہے۔ اس کا اندازہ قضاوت کے باب میں قاضی کی ذمہ داریوں اور آداب قضاوت سے مربوط ان احکام اور تعلیمات کی طرف رجوع کرنے سے ہوتا ہے کہ جو قرآن وسنت کی نصوص اور فقہاء کی کتابوں میں وارد ہوئے ہیں۔

اسلام نے قاضی کو قضاوت انجام دیتے وقت جن چیزوں کے لحاظ کا حکم دیا ہے وہ درج ذیل ہیں:

۱۔ قضاوت کے دوران طرفینِ نزاع کے مابین سلام کرنے، سلام کا جواب دینے، نگاہ کرنے، کلام کرنے، بیٹھنے اور توجہ کرنے میں مکمل غیر جانبداری اور مساوات کا لحاظ کرنا۔

۲۔ جب تک دونوں فریقین کے دلائل کو مکمل سن نہ لے اس وقت تک فیصلہ کرنے میں جلدی نہ کرنا، اور دونوں کے دلائل کو سننے میں مکمل صبر اور حوصلے سے کام لینا۔

۳۔ بھوک، پیاس، تھکاوٹ، نیند، افسردگی، خوشی اور غصے کی حالت میں قضاوت انجام نہ دینا۔

۴۔ طرفینِ نزاع میں سے کسی ایک کی دعوت کو قبول کر کے اس کا مہمان نہ بننا۔

اب یہاں ان موارد کی توضیح کے لیے فقہاء کی آراء نقل کی جاتی ہیں اور اس بارے میں جو روایات نقل ہوئی ہیں وہ بھی بیان کی جاتی ہیں تا کہ تنازعات کے موقع پر لوگوں کے حقوق کے تحفظ کے لیے اسلام نے قاضی کو جن امور کا خیال رکھنے کا حکم دیا ہے وہ روشن ہو سکیں اور نتیجے میں قضاوت کے معاملے میں اسلام کی باریک بینی زیادہ واضح ہو سکے۔

محقق حلی **شرائع الاسلام** میں باب قضاء کے اندر قضاوت کے دوران قاضی کی سات ذمہ داریاں بیان کرتے ہیں، وہ لکھتے ہیں:

''قاضی کی سات ذمہ داریاں ہیں:

۱۔ قاضی کی پہلی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ فریقینِ نزاع کے درمیان سلام کرنے، بیٹھنے، نگاہ کرنے، بات کرنے، اور عادلانہ فیصلہ کرنے میں مساوات کا لحاظ کرے۔ البتہ قلبی رجحان میں مساوات کا لحاظ کرنا ضروری نہیں ہے کیونکہ غالباً یہ ایک مشکل کام ہے۔

۲۔قاضی کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ فریقین میں سے کسی ایک کو ایسے نکتہ کی طرف راہنمائی کرے جس سے اس کے فریق کو نقصان پہنچے نیز قاضی فریقین میں سے ایک کو اس کی دلیل کی طرف بھی راہنمائی نہیں کر سکتا کیونکہ اس سے تنازعات کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے حالانکہ قاضی کا کام یہ ہے کہ وہ تنازعات کو ختم کرے۔

۳۔جب دونوں فریقین خاموش ہوں تو بہتر یہ ہے کہ قاضی دونوں سے مخاطب ہو کر کہے کہ بات شروع کریں یا کہے کہ تم میں سے جو مدعی ہے وہ بات کا آغاز کرے۔

۴۔جب آپس میں تنازعہ کرنے والے دونوں فریقین قاضی کے سامنے اپنا نزاع پیش کریں تو اس صورت میں اگر حکم واضح ہو تو قاضی پر لازم ہے کہ فیصلہ صادر کرے، لیکن اس سے پہلے بہتر یہ ہے کہ انہیں آپس میں صلح کرنے کی ترغیب دے۔

۵۔جب فریقین نزاع بالترتیب قاضی کے پاس آئیں تو اسی ترتیب سے ہی ان کی باتیں سنی جائیں گی۔

۶۔جب مدعی اپنی بات شروع کرے تو درمیان میں اگر مدعا علیہ اس کی بات قطع کر کے کچھ بولنا چاہے تو اس کی بات نہیں سنی جائے گی۔

۷۔جب فریقین نزاع میں سے کوئی ایک پہلے بات شروع کرے تو پہلے اسی کی بات سنی جائے گی، اور اگر دونوں ایک ساتھ بات شروع کریں تو ان میں سے جو اپنے فریق کے دائیں جانب بیٹھا ہوگا اس کی بات پہلے سنی جائے گی۔''(۲۱)

شہید ثانی شرح اللمعة میں قاضی کی ذمہ داریاں بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''قاضی پر لازم ہے کہ وہ فریقین نزاع کے ساتھ بات کرنے، انہیں سلام کرنے، ان کے سلام کا جواب دینے اور ان کی طرف نگاہ کرنے میں مساوات کا لحاظ کرے۔اسی طرح اس پر لازم ہے کہ احترام اور تعظیم کی دوسری اقسام جیسے داخلہ کی اجازت دینے میں، اٹھنے، بیٹھنے، ان کی طرف توجہ کرنے، ان کی باتوں کو سننے اور ان کے ساتھ انصاف کرنے میں بھی مساوات کا لحاظ کرے۔البتہ فریقین نزاع کے مابین قلبی رجحان میں مساوات کا لحاظ کرنا ضروری نہیں ہے۔''(۲۲)

امام ماوردی اور قاضی ابویعلی نے قاضی کی ذمہ داریوں کو بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

''قاضی پر واجب ہے کہ وہ فیصلہ کرتے وقت طاقتور اور کمزور کے درمیان، اور باشرف اور کم شرف کے درمیان مساوات کا لحاظ کرے۔ اور اسی طرح فیصلہ صادر کرتے وقت خواہشات نفسانی کی پیروی نہ کرے۔''(۲۳)

نیز قاضی ابویعلی بغدادی (م ۴۵۸ھ) نے اپنی کتاب **الجامع الصغیر** میں آداب قضاوت کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''قاضی کے اوپر واجب ہے کہ وہ فریقین نزاع کے درمیان بولنے میں، توجہ کرنے میں اور بیٹھنے میں مساوات کا لحاظ کرے، اور ضروری ہے کہ قاضی ان میں سے ایک کی طرف دوسرے کی نسبت زیادہ توجہ نہ کرے۔''(۲۴)

یہاں تک قاضی کی ذمہ داریوں اور آداب قضاوت سے مربوط شیعہ سنی فقہاء اور علماء کے آراء اور فتاویٰ کا ایک اجمالی خلاصہ پیش کیا گیا اب اس سلسلے میں جو روایات نقل ہوئی ہیں ان میں سے بعض منتخب روایات نقل کی جاتی ہیں تا کہ اسلامی تعلیمات میں قضاوت کی اہمیت زیادہ واضح ہو سکے۔

حضرت امّ سلمہ، پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کرتی ہیں کہ آپؐ نے فرمایا:

'' اذا ابتلی احدکم بالقضاء بین المسلمین ، فلیسوّ بینھم فی النظر و المجلس و الاشارة ، و لا یرفع صوتَه علی احد الخصمین اکثر من الآخر .''(۲۵)

جب تم میں سے کوئی مسلمانوں کے درمیان قضاوت انجام دینا چاہے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ ان کے درمیان نگاہ کرنے، بیٹھنے اور اشارہ کرنے میں مساوات کا لحاظ کرے، نیز ضروری ہے کہ قاضی فریقین کے ساتھ بات کرتے وقت اپنی آواز اونچی کرنے اور کم کرنے میں بھی مساوات کا لحاظ کرے۔

ایک دوسرے مقام پر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام سے مخاطب ہو کر فرمایا:

''اذا تقاضَی الیک رجلان، فلا تقضِ للاوّل حتّی تسمعَ کلامَ الآخر .''(۲۶)

جب دو شخص اپنے نزاع کے بارے میں تم سے فیصلہ چاہیں تو اس وقت تک ان کے مابین فیصلہ صادر نہ کرنا جب تک دونوں فریقین کی بات مکمل سن نہ لو۔

ایک اور مقام پر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے غصے کی حالت میں قضاوت انجام دینے سے منع کرتے ہوئے فرمایا ہے:

"لا یقضی القاضی بین اثنین و هو غضبان."(۲۷)

قاضی کو چاہیے کہ جب وہ غصے کی حالت میں ہو تو فریقین کے درمیان قضاوت انجام نہ دے۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قاضی کو فریقین نزاع کے مابین عدالت کے لحاظ کی تاکید کرتے ہوئے فرمایا ہے:

" من ابتلی بالقضاء بین المسلمین فالیعدل بینهم فی لحظه و اشارته و مجلسه و مقعده."(۲۸)

جو شخص مسلمانوں کے درمیان قضاوت کا عہدہ دار ہونا چاہتا ہے اس کو چاہیے کہ ان کے درمیان اشارہ کرنے اور بیٹھنے میں عدالت کا لحاظ کرے۔

حضرت عمر نے حضرت ابوموسی اشعری کو قضاوت کے بارے میں جو خط لکھا ہے اس میں کہتے ہیں:

"آسِ بین الناس فی وجهک و عدلک و مجلسک حتی لا یطمع شریف فی حیفک و لا ییأس ضعیف من عدلک."(۲۹)

لوگوں کے درمیان اپنی توجہ میں اور اپنے عدل میں اور بیٹھنے میں مساوات کا لحاظ کرو تا کہ بڑے لوگ تمہاری ناانصافی سے امید نہ لگا بیٹھیں اور کمزور افراد تمہارے انصاف سے مایوس نہ ہو جائیں۔

یہاں قاضی کی ذمہ داریوں اور آداب قضاوت سے متعلق مندرجہ بالا بیان کردہ فقہاء کے فتاوی اور پیغمبر اکرمؐ کی روایات سے اس بات کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اسلامی نظام قضاوت میں لوگوں کے حقوق کو کتنی اہمیت دی گئی ہے کہ قاضی کو قضاوت انجام دیتے وقت محکمہ عدالت کے اندر فریقین نزاع کے مابین ظاہراً غیر اہم دکھائی دینے والے بہت سے موارد میں بھی عدالت اور مساوات کے لحاظ کا خصوصی حکم دیا گیا ہے تا کہ قاضی کے سامنے فریقین نزاع کو اپنا مقدمہ بیان کرنے میں کسی ہچکچاہٹ کا سامنا نہ کرنا پڑے اور وہ اپنا اپنا مدعی بہتر انداز میں بیان کر سکیں جس سے قاضی کے لیے معاملہ کی نوعیت واضح ہو سکے اور وہ صحیح فیصلہ صادر کر سکے، نتیجے میں کسی کا حق

ضائع نہ ہو بلکہ ہر حقدار کو اس کا اپنا حق ملے۔ اسلامی نظام قضاوت کے اندر محکمہ عدالت میں فریقین نزاع کے درمیان مساوات اور عدالت کے لحاظ کا جو حکم قاضی کو دیا گیا ہے اس میں معاشرے کے ہر طبقے کے افراد شامل ہیں اور اس حکم سے کوئی طبقہ مستثنیٰ نہیں ہے اس لیے قاضی کی ذمہ داری ہے کہ اگر اس کی عدالت میں رجوع کرنے والوں میں سے ایک حاکم ہو اور دوسرا ایک عام طبقے کا آدمی ہو، تب بھی وہ ان دونوں کے مابین آداب قضاوت کے سلسلے میں ذکر شدہ تمام موارد میں عدالت اور مساوات کا لحاظ کرے۔ اسی طرح فریقین کی شخصیت، مذہب، حسب ونسب، شکل وصورت قاضی کو متاثر نہ کرے۔ بلکہ ہر حال میں وہ ان کے مابین عدالت اور مساوات کا لحاظ کرے اور حکم واضح ہونے کے بعد حق کی بنیاد پر فیصلہ صادر کرے۔

آداب قضاوت سے متعلق ذکر شدہ مطالب قاضی سے مربوط ہیں کہ قاضی کو کہا گیا ہے کہ جب فریقین نزاع اپنا مقدمہ اس کے سامنے پیش کریں تو آداب قضاوت سے مربوط مذکورہ بالا نکات کی رعایت کرے۔ اسلامی تعلیمات میں جس طرح قاضی کو آداب قضاوت کے لحاظ حکم دیا گیا ہے اسی طرح فریقین نزاع یعنی مدعی اور مدعا علیہ کو بھی بعض نکات کے لحاظ کا حکم دیا گیا ہے جن کی رعایت کرنے سے ان کے مابین نزاع جلد برطرف ہوسکتا ہے، اور نزاع کدورت میں بدلنے سے رک سکتا ہے، اور وہ وہی نکات ہیں جنہیں حضرت امام سجادؑ نے مدعی اور مدعا علیہ کے حقوق کا تذکرہ کرتے ہوئے بیان کیا ہے۔ امام سجادؑ مدعی کے حقوق بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''جو شخص تمہارے خلاف کوئی دعوی دائر کرتا ہے اس کا حق تمہارے اوپر یہ ہے کہ اگر وہ حق اور سچائی پر ہو تو تم اس کی دلیل کو رد نہ کرو، اور اس کے دعوی کو باطل قرار نہ دو بلکہ تم خود اپنے نفس کی مخالفت کرتے ہوئے کسی گواہ کی ضرورت کے بغیر اس کے حق میں گواہی دو۔ کیونکہ یہ تمہارے اوپر خدا کا حق ہے، اور اگر وہ اپنے دعوی میں حق پر نہ ہو اور باطل دعویٰ کر رہا ہو تو نرمی کے ساتھ اسے اس کے باطل دعوی کے نتیجے سے ڈراؤ اور اسے اس کے دین کا واسطہ دے کر اور خدا کو یاد دلاتے ہوئے اس کی مخالفت کی شدت کو کم کرو اور کوئی بری بات زبان پر لانے سے اجتناب کرو کیونکہ ایسی بات تمہارے خلاف اس کی دشمنی میں کوئی کمی ایجاد نہیں کرے گی بلکہ اس طرح تو تم خود بھی اس کے گناہ میں شریک قرار پاؤ گے اور اس کی عداوت میں مزید اضافہ ہوگا، کیونکہ بری بات فتنہ ایجاد کرتی ہے اور اچھی بات فتنہ کو خاموش کرتی ہے اور کوئی قوت اللہ کی عنایت کے سوا نہیں ہے۔'' (۳۰)

یعنی اس کا خلاصہ یہ ہے کہ جو تمہارے خلاف کوئی دعوا کرتا ہے وہ دو حالتوں سے خالی نہیں ہے: یا تو وہ اپنے دعوے میں سچا ہے اور وہ حق پر ہے، تو اس صورت میں اس کا حق تمہاری گردن پر یہ ہے کہ تم اس کے حق کو قبول کرو اور اپنے خلاف فیصلہ کرو چونکہ یہ خدا کا حق ہے، اور اگر اس کا دعوا باطل ہے تو یہاں اس کا حق تمہارے اوپر یہ ہے کہ تم اس کے ساتھ نرمی سے پیش آؤ اور صبر و تحمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے یاد خدا کے ساتھ اسے اس کی غلطی کی طرف متوجہ کرو۔

اس کے بعد مدعا علیہ کے حقوق بیان کرتے ہوئے امام سجاد علیہ السلام کہتے ہیں:

''جس کے خلاف تم کوئی دعوا دائر کرتے ہو، اس کا حق تمہارے اوپر یہ ہے کہ اگر تم اپنی بات میں سچے ہو اور حق تمہارا ہے تو اس نزاع کے خاتمہ کی خاطر تم نرمی کے ساتھ بات کرو، کیونکہ دعوا مد مقابل شخص کے کانوں کو بھاری لگتا ہے لہٰذا تم آرام اور نرمی سے اپنی دلیل کو بیان کرو اور واضح و لطیف بیان کے ساتھ اپنی بات اور دلیل پیش کرو کیونکہ کہیں ایسا نہ ہو کہ نزاع کے موقع پر زیادہ تو تو میں میں کرنے کی وجہ سے اصل دلیل ہی تمہارے ہاتھ سے نکل جائے اور پھر بعد میں تم اس کی تلافی بھی نہ کر سکو کہ کوئی قوت اللہ کی عنایت کے سوا نہیں ہے۔'' (۳۱)

اس کا خلاصہ یہ ہے کہ جب نزاع کے موقع پر تم حق پر ہو تو یہاں تمہیں چاہیے کہ تم آرام اور نرمی کے ساتھ اپنی دلیل بیان کرتے ہوئے اپنے حق کو ثابت کرو اور اپنی دلیل کو کمزوری کے ساتھ بیان مت کرو کہ کہیں تمہارا حق ضائع نہ ہو جائے جس کی بعد میں تلافی ممکن نہ ہو سکے۔

جب بھی کوئی کسی کے ساتھ اختلاف کرے چاہے وہ اختلاف اجتماعی نوعیت کا ہو یا فردی نوعیت کا، ہر صورت میں خود اختلاف کرنے والے افراد بہتر طور پر جانتے ہیں کہ حق کس کے ساتھ ہے اور جس مسئلہ میں وہ اختلاف کر رہے ہیں اس میں اصل حقدار کون ہے۔ لہٰذا اگر تمام انسان خود ہی اسلامی دستورات اور حضرت امام سجادؑ کے بتائے ہوئے مذکورہ بالا نکات پر عمل کریں تو یقیناً آپس کے نزاعات، عدلیہ اور محکمہ قضاء کی طرف رجوع کیے بغیر ہی حل ہو جائیں گے یا کم از کم جلد فیصلہ ہو جائیں گے۔ یہ لوگوں کی اسلامی دستورات سے دوری کا نتیجہ ہے جس کی بناء پر لوگ نزاعات کے موقع پر اسلامی دستورات کا لحاظ کیے بغیر دوسروں کے حقوق پر تجاوز کرتے ہیں۔ قرآن و سنت میں انسانوں کے لیے بہترین زندگی کے اصول بیان ہوئے ہیں اور اس زندگی میں اگر کبھی ایک دوسرے کے ساتھ اختلافات اور تنازعات پیش آئیں تو ان کے حل کے لیے بھی قضاوت کا ایک جامع اور بہترین نظام بیان ہوا

ہے۔ضرورت صرف اس امر کی ہے کہ دنیا میں رہنے والے تمام انصاف پسند انسان اپنی اپنی زندگیوں میں اسلامی دستورت کی پیروی کریں اور اپنے معاشرے کے عدالتی نظام کو اسلامی نظام قضاوت کے مطابق تطبیق دیں تا کہ مشکلات برطرف ہو جائیں۔

منابع و مآخذ

۱): مودودی، سید ابوالاعلیٰ، معاشیات اسلام، ص: ۳۸۰، چاپ ۱۸، اسلامک پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۰۱ء۔

۲): الازہری، ابومنصور محمد ابن احمد، تہذیب اللغۃ، جلد ثالث، صفحہ ۲۹۸۶ طبع اوّل، دار المعرفۃ، بیروت، ۲۰۰۱ء، ۱۴۲۲ھ، ابن زکریا، ابوالحسین، احمد ابن فارس، مقاییس اللغۃ، صفحہ ۹۹، جلد خامس، مکتب الاعلام الاسلامی، قم، ۱۴۰۴ھ، الموسوعۃ الفقھیۃ، صفحہ ۲۸۲، جلد ۳۳، طبع اوّل، وزرات الاوقاف والشئون الاسلامیہ، الکویت، ۱۹۹۵ء، ۱۴۱۶ھ، ابن منظور، لسان العرب، صفحہ ۲۰۹ جلد ۱۱، طبع اوّل، دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۹۹۸ء، ۱۴۰۸ھ۔

۳): اصفہانی، علامہ راغب، مفردات الفاظ القرآن، صفحہ ۶۷۴ طبع اوّل، دار القلم، دمشق، ۱۹۹۶ء، ۱۴۱۶ھ۔

۴): الاحمد نگری، عبدالنبی بن عبدالرسول، موسوعۃ مصطلحات جامع العلوم، صفحہ ۷۰۰، طبع اوّل، مکتبہ لبنان ناشرون، بیروت، ۱۹۹۸ء۔

۵): الموسوعۃ الفقھیۃ، جلد ۳۳، صفحہ ۲۸۲، ۲۸۳، طبع اوّل، وزارۃ الاوقاف والشئون الاسلامیہ، الکویت، ۱۹۹۵ء، ۱۴۱۶ھ۔

۶): خمینی، سید روح اللہ، تحریر الوسیلہ، جلد ۲، صفحہ ۸۲۳، طبع اوّل، مؤسسۃ تنظیم وشر آثار امام خمینی، تہران، ۱۳۷۹ش، ۱۴۲۱ھ۔

۷): متقی الھندی، علاء الدین علی المتقی بن حسام الدین، کنز العمال، جلد سادس، صفحہ ۹۵، ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ بن سورہ، سُنن الترمذی، جلد ثالث، صفحہ ۶۱، دار الفکر، بیروت، ۱۹۹۴ء، ۱۴۱۴ھ، وکیع، محمد بن خلف بن حیان، اخبار القضاۃ، ص: ۲۲، السید سابق، فقہ السنّہ، جلد ۳، ص: ۲۲۵، الری الشہری، محمدی، میزان الحکمۃ، جلد ۸، صفحہ ۱۹۱، العاملی، شیخ حر، وسائل الشیعہ، جلد ۲۷، صفحہ ۱۹۔

۸): متقی الھندی، علاء الدین علی المتقی بن حسام الدین، کنز العمال، جلد ۶، صفحہ ۹۳، وکیع، محمد بن خلف بن حیان، اخبار القضاۃ، ص: ۲۷، الری الشہری، محمدی، میزان الحکمۃ، جلد ۸، صفحہ ۱۹۲۔

۹): رسولی محلاتی، سید ہاشم، غرر الحکم و درر الکلم در آمدی، جلد ثانی، طبع رابع، دفتر نشر فرہنگ اسلامی، تہران، ۱۳۸۰ش، صفحہ ۳۱۹۔

۱۰): وکیع، محمد بن خلف بن حیان، اخبار القضاۃ، ص: ۳۵۔ البیہقی، امام ابوبکر احمد بن الحسین بن علی، السنن الکبریٰ، جلد ۱۵، ص: ۳۴، دار الفکر، بیروت۔

۱۱): نہج البلاغہ نامہ ۴۷۔

۱۲): رسولی محلاتی، سید ہاشم، غرر الحکم و درر الکلم در آمدی، جلد ۲، صفحہ ۳۱۹۔۲۴۔ میزان الحکمہ ج ۸، صفحہ ۱۸۷۔

۱۳): طوسی، شیخ ابوجعفر محمد ابن حسن ابن علی، المبسوط فی فقہ الامامیہ، جلد ۸، المکتبۃ الرضویہ، ۱۳۵۱ش، صفحہ ۸۲۔

۱۴): الموسوعۃ الفقھیۃ، جلد ۳۳، صفحہ ۲۹۰۔

۱۵): المحقق الحلی، ابوالقاسم نجم الدین جعفر بن الحسن، شرائع الاسلام فی مسائل الحلال والحرام، جلد رابع، ص: ۶۱، تحقیق وتعلیق: عبدالحسین محمد علی، طبع ثالث، دار الاضواء، بیروت، ۱۹۹۸ء، ۱۴۱۸ھ۔

۱۶): انصاری، شیخ مرتضی، القضاء والشھادات، ص: ۲۹، طبع اولی، مؤتمر المنوی للشیخ الانصاری، ۱۴۱۵ھ۔

۱۷): الماوردی، امام ابوالحسن علی بن محمد بن حبیب البصری الشافعی البغدادی، الاحکام السلطانیّہ والولایات الدینیّہ، ص: ۸۱، ۸۲، تحقیق: سمیر مصطفیٰ رباب، المکتبۃ العصریۃ، بیروت، ۲۰۰۳ء، ۱۴۲۴ھ۔ ابویعلی، قاضی محمد بن الحسین الفراء الحنبلی، الاحکام السلطانیۃ، ص: ۷۱، ۷۲، دار الفکر، بیروت، ۲۰۰۰ء، ۱۴۲۰ھ۔

۱۸): ابن رشد قرطبی، القاضی ابوالولید محمد بن احمد بن محمد بن احمد، بدایۃ المجتھد ونھایۃ المقتصد، جلد ۲، ص: ۸۲۴، طبع اول، دار ابن حزم، بیروت، ۲۰۰۳ء، ۱۴۲۴ھ۔

۱۹): الموسوعۃ الفقھیہ، جلد ۳۳، صفحہ ۲۹۱ تا ۲۹۳۔

۲۰): نہج البلاغہ، نامہ ۵۳۔

۲۱):المحقق الحلی،شرائع الاسلام فی مسائل الحلال والحرام،،جلد۴،ص۷۵،۷۶۔

۲۲):جبعی العاملی،شہید زین الدین (معروف بہ شہید ثانی)،الروضۃ البھیۃ فی شرح اللمعۃ الدمشقیۃ،جلد۱،ص: ۳۵۰،طبع رابع،دارالتفسیر،قم،۱۳۸۲ھ ش۔وخمینی،روح اللہ،تحریرالوسیلہ،جلد۲،ص۸۲۶،۸۲۷،طبع اول،مئوسسہ تنظیم ونشرآثارامام خمینی،تہران،۱۴۲۱ھ،۱۳۷۹ھ ش۔

۲۳):الماوردی،امام ابوالحسن علی بن محمد بن حبیب البصری البغدادی،الاحکام السلطانیہ والولایات الدینیہ،ص: ۸۸۔قاضی ابویعلی،محمد بن الحسین بن خلف بن احمد بن الفراء البغدادی،الاحکام السلطانیہ،ص:۷۷۔

۲۴):قاضی ابویعلی،محمد بن الحسین بن خلف بن احمد بن الفرّاء البغدادی،الجامع الصغیر فی الفقہ علی مذھب الامام احمد بن محمد بن حنبل،ص:۳۶۳،تحقیق وتعلیق:الدکتور ناصر بن سعود بن عبداللہ السلامہ،طبع اولی،دارالطس للنشر والتوزیع، ریاض،۲۰۰۰ء،۱۴۲۱ھ۔

۲۵):وکیع،محمد بن خلف بن حیان،اخبارالقضاۃ،ص:۳۳،مراجعہ:سعید محمد اللحّام،طبع اولی،عالم الکتب،بیروت، ۲۰۰۱ء،۱۴۲۲ھ۔البیہقی،امام ابوبکر احمد بن الحسین بن علی،السنن الصغیر،جلد۲،ص:۳۷۴تحقیق:عبدالسلام عبدالشافی، احمد قبانی،طبع اول،دارالکتب العلمیہ بیروت،۱۹۹۲ء،۱۴۱۲ھ۔

۲۶): الترمذی،ابوعیسی محمد بن عیسی بن سورہ،سنن الترمذی،جلد ثالث،ص:۶۳،دارالفکر،بیروت،۱۹۹۴ء، ۱۴۱۴ھ۔وکیع،محمد بن خلف بن حیان،اخبارالقضاۃ،ص:۶۳۔الماوردی،الاحکام السلطانیۃ والولایات الدینیہ،ص: ۸۳۔قاضی ابویعلی،الاحکام السلطانیہ،ص:۷۲۔البیہقی،امام ابوبکر احمد بن الحسین بن علی،السنن الصغیر،جلد۲،ص: ۴۷۲۔البیہقی،امام ابوبکر احمد بن الحسین بن علی،السنن الکبری جلد۱۵،ص:۳۰،دارالفکر،بیروت۔متقی الہندی،علاء الدین علی بن حسام الدین،کنز العمال،جلد۶،ص:۱۰۰۔ ابن الدھان،الشیخ ابوشجاع محمد بن علی بن شعیب،تقویم النظر فی مسائل خلافیۃ ذائعۃ ونُبذ مذھبیۃ نافعہ،جلد۲،ص:۳۸۴،تحقیق:ایمن نصرالدین الازھری،طبع اول،دارالکتب العلمیہ،بیروت،۲۰۰۱ء،۱۴۲۱ھ۔السید سابق،فقہ السنّہ،جلد۳،ص:۲۲۴۔شیخ صدوق،محمد بن علی،من لایحضرہ الفقیہ،جلد۳،ص؛۱۴،طبع ثانی،دارالاضواء،بیروت،۱۹۹۲ء،۱۴۳۱ھ۔حرعاملی،وسائل الشیعہ،جلد۲۷،ص:۲۱۶۔ نوری الطبرسی،میرزا حسین،مستدرک الوسائل ومستنبط المسائل،ص:۳۵۱،طبع ثانی،مؤسسہ آل البیت لاحیاء التراث،بیروت،۱۹۸۸ء،۱۴۰۹ھ۔محمدی ری شہری،میزان الحکمۃ،جلد۸،ص:۱۹۶۔

۲۷): ابن ماجہ قزوینی، ابوعبداللہ محمد بن یزید، سنن ابن ماجہ، ص: ۲۴۹، بیت الافکار الدولیہ للنشر والتوزیع، ریاض۔ ترمذی، ابوعیسی، محمد بن عیسی بن سورہ، جلد۳، ص ۶۵۔ البخاری، امام ابوعبداللہ محمد بن اسماعیل، صحیح البخاری، ص: ۱۳۶۵ تحقیق: ابوصہیب الکرمی، بیت الافکار الدولیہ للنشر والتوزیع، ریاض، ۱۹۹۸ء، ۱۴۱۹ھ۔ ابوالحسین مسلم بن الحجاج القشیری، صحیح مسلم، ص ۸۶۵، طبع اول، دارالفکر، بیروت، ۲۰۰۰ء، ۱۴۲۱ھ۔ النسائی، امام ابوعبدالرحمٰن احمد بن شعیب، سنن النسائی، ص: ۸۳۸، ۸۴۲، طبع اول، المکتبۃ العصریہ، بیروت، ۲۰۰۶ء، ۱۴۲۶ھ۔ وکیع، محمد بن خلف بن حیان، اخبار القضاۃ، ص: ۶۰، ۱۲۹۶۔ البیہقی، امام ابوبکر احمد بن الحسین بن علی، السنن الکبری، جلد۱۵، ص: ۲۷۔ البیہقی، امام ابوبکر احمد بن الحسین بن علی، السنن الصغیر، جلد۲، ص: ۴۶۹۔ ابن ابی الحدید، شرح نہج البلاغہ، جلد۱۷، ص: ۶۱، تحقیق: محمد ابوالفضل ابراہیم، طبع ثانی، داراحیاء التراث العربی، بیروت، ۱۹۶۷ء، ۱۳۸۷ھ۔ متقی الہندی، علاء الدین علی بن حسام الدین، کنز العمال، جلد۶، ص: ۱۰۱۔ السید سابق، فقہ السنّہ، جلد۳، ص: ۲۲۸۔ یسری، السید محمد، جامع الفقہ، جلد۷، ص: ۱۳۸۔ شیخ صدوق، محمد بن علی، من لایحضرہ الفقیہ، جلد۳، ص: ۶۔ حرعاملی، وسائل الشیعہ، جلد۲۷، ص ۳۴، ۲۱۳۔

۲۸): ابن ابی الحدید معتزلی، شرح نہج البلاغہ، جلد۱۷، ص: ۶۱۔ متقی الہندی، علاء الدین علی بن حسام الدین، کنز العمال، جلد۶، ص: ۱۰۲۔ حرعاملی، وسائل الشیعہ، جلد۲۷ ص: ۲۱۴۔

۲۹): وکیع، محمد بن خلف بن حیان، اخبار القضاۃ، ص: ۵۴۔ الماوردی، ابوالحسن علی بن محمد بن حبیب البصری، الاحکام السلطانیۃ والولایات الدینیۃ، ص: ۱۱۷۔ یُسری، السید محمد، جامع الفقہ، جلد۷، ص ۱۱۹۔ السید سابق، فقہ السنّہ، جلد۳، ص: ۲۳۰۔

۳۰): حرّانی، شیخ ابومحمد، تحف العقول عن آل الرسول، ص: ۴۶۸، ترجمہ: صادق حسن زادہ، چاپ ۸، انتشارات آل علی، قم، ۱۳۸۶۔ مشایخی، قدرت اللہ، حقوق از دیدگاہ امام سجاد، ص: ۴۵۹، چاپ سوم، انتشارات انصاریان، قم، ۲۰۰۶ء، ۱۴۲۷ھ۔

۳۱): حرّانی، شیخ ابومحمد، تحف العقول عن آل الرسول، ص: ۴۶۸۔ مشایخی، قدرت اللہ، حقوق از دیدگاہ امام سجاد، ص: ۴۵۹۔

سیرت نبوی میں رفق و مدارا کے انداز

(آخری قسط)

محمد جواد اصغری

ترجمہ: سید مشاہد عالم رضوی

غیر مسلمانوں کے ساتھ پیغمبرؐ کے تعلقات کی شرعی حیثیت

جب فقہاء کسی موضوع کا حکم بیان کرنا چاہتے ہیں تو سب سے پہلے اس کے قاعدہ اولیہ پر نظر کرتے ہیں تا کہ بتائیں حکم کا سرچشمہ، شرع ہے یا عقل، یا عرف و عادت؟

لہٰذا رفق و مدارات کی اس بحث میں ہم سب سے پہلے یہی بنیادی سوال قائم کرتے ہیں، کہ آخر غیر مسلمانوں کے ساتھ پیغمبرؐ کے تعلقات کا اصل قرینہ کیا ہے؟ صلح و مصلحت یا جنگ؟ اس سلسلہ میں دو نظریہ ہیں:

۱)۔ اصالت جنگ

۲)۔ اصالت صلح

نظریہ اول: اصالت جنگ

یہ نظریہ مستشرقین اور بعض سنی و شیعہ فقہا کا ہے، اس نظریہ کے لحاظ سے اسلام کے بین الاقوامی حقوق کا دار و مدار جہاد اسلامی پر قائم ہے لہٰذا مسلمانوں کا فریضہ ہے کہ وہ دشمنان اسلام کو سرکوب کریں اور انھیں اسلام قبول کرنے پر تیار کریں۔ انگریز مستشرق مسٹر برنارڈ لوئیس کہتے ہیں: اسلامی دنیا میں خارجہ پالیسی اور بین الاقوامی روابط

کا طریقہ عصر حاضر کی تمام سیاسی کمیٹیوں اور ادارات سے مختلف ہے کفار کو مسلمان کرنے اور انھیں خلیفہ کا تابع فرمان بنانے کے لئے ہمیشہ سے مسلمانوں پر جنگ واجب کفائی رہا ہے۔ البتہ جنگ کی یہ حالت اگر کبھی ختم بھی ہوئی تو اس کی حیثیت وقتی مصالحت سے زیادہ نہیں رہی ہے۔[1]

علمائے اہل تسنن میں ''موفق الدین ابن قدامہ صاحب المغنی اور شمس الدین ابن قدامہ صاحب الشرح الکبیر'' یہ دونوں اصالت جنگ کے قائل ہیں، ان کے بیان کے مطابق کم از کم سال میں ایک مرتبہ کفار سے جنگ کرنا لازمی ہے، مگر یہ کہ مسلمان جنگی اسباب کی قلت اور ضعف کا شکار ہو جائیں تو ایسی صورت میں جہاد ضروری نہیں ہے۔[2]

ان لوگوں کے علاوہ بعض شیعہ فقہا بھی اصالت جنگ کے قائل ہیں، علامہ حلی، شہید ثانی، محمد جواد حسینی عاملی، محمد جواد حسینی صاحب مفتاح الکرامہ لکھتے ہیں:

''**الاصل عدم الصلح و القتال و الاخذ با السیف**''[3]

اصل اولی صلح نہیں بلکہ کفار سے جنگ ہے۔

قائلین اصالت جنگ کے دلائل

۱۔ آیات قرآن:

جو حضرات اصالت جنگ کا نظریہ رکھتے ہیں ان کی پہلی دلیل آیات قرآنی ہے جن کی چند قسمیں ہیں:

الف:۔ جہاد والی آیتیں

اصالت جنگ کے قائلین کی پہلی دلیل وہ آیتیں ہیں جو وجوب جہاد پر دلالت کرتی ہیں اور مسلمانوں کو کافروں سے مقابلہ کرنے کی دعوت دیتی ہیں۔ سورہ توبہ آیت نمبر ۵ سورہ بقرہ آیات نمبر ۱۹۰ و ۱۹۳، انھیں آیات میں سے ہیں اسی طرح وہ آیات جو کفار، ظالمین اور مشرکین سے لڑنے کا حکم دیتی ہیں، متجاوزین سے جنگ

۱۔ امیر بہزادی، نشریہ دانشکدہ حقوق وعلوم سیاسی، اصول وروابط بین الملل وتحولات آن در اسلام ش ۱۲، ص ۱۲۹ و ۱۳۰ سال ۱۳۵۱

۲۔ موفق الدین عبداللہ ابن احمد ابن قدامہ، وشمس الدین ابن قدامہ المقدسی، المغنی والشرح الکبیر، ج ۱ ص ۳۶۷ و ۳۶۸۔

۳۔ محمد جواد الحسینی العاملی، مفتاح الکرامۃ فی شرح القواعد، ج ۷ ص ۷۔

کرنے پر ابھارتی ہیں، ۱ اور وہ آیتیں جو اہل کتاب سے جہاد کرنے کا دستور دیتی ہیں ۲ کہ آیات کے اس مجموعہ سے اصالت جنگ کا نظریہ سامنے آتا ہے ۳ یعنی کفار کو چاہئے یا وہ اسلام کے احکام کو تسلیم کریں یا پھر کفر کی حالت میں قتل ہو جائیں، البتہ اس نظریہ کا اصل مطلب یہ ہے کہ اسلامی معاشرہ میں روح مبارزہ ہمیشہ ہمیشہ زندہ رہے اور اسلام دشمن عناصر سے جہاد کرنے کا جذبہ ٹھنڈا نہ ہونے پائے۔

اصالت جنگ کے نظریہ پر اعتراض

جو حضرات اصالت جنگ کے قائل ہیں فلسفہ جہاد کے بارے میں ان کا یہ قول کہ ''اسلامی معاشرہ میں اقدار کی حفاظت اور اس سے دفاع کے لئے جہاد و ایثار لازمی ہے'' پسندیدہ و قابل قبول ہے، لیکن دیگر ادیان کے ماننے والوں اور اسلام کی طرف مشرکین و کفار کو دعوت دینے کے لئے جہاد کو پہلے درجہ میں رکھنا قابل قبول نہیں ہو سکتا ۔اس لئے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی ۱۳ سالہ مکی زندگی میں جبر و تشدد اختیار کرنے کے بجائے مصالحانہ طریقہ سے مشرکین کو دعوت اسلام دیتے رہے اور آپ کا یہی انداز تبلیغ مدینہ میں بھی جاری رہا۔ دوسری جانب حکم جہاد کے لئے خود اصول و قوانین ہیں مزید یہ کہ بعض آیات قرآنی دوسری آیات کو نظر انداز کر کے کبھی بھی کسی حکم کا مآخذ نہیں بن سکتیں، جب کہ قرآن مجید کی بعض آیتیں مطلق ہیں اور بعض مقید بعض عام ہیں تو بعض آیات خاص ہیں اور جن آیات میں حکم جہاد پایا جاتا ہے وہ قید و شرط رکھتی ہیں مطلق نہیں ہیں کہ ہر جگہ انھیں نافذ کیا جا سکے بلکہ اس کی کوئی نہ کوئی دلیل و علت پائی جاتی ہے اس بناء پر اذن جہاد کی مختلف وجہیں ہیں جسے قرآن مجید بیان کرتا ہے، فتنہ انگیزی، مشرکین کی جانب سے مسلمانوں پر ظلم و تجاوز، مسلمانوں کے اموال کی بربادی، گھروں کی ویرانی وغیرہ یہ وہ اسباب و وجوہات ہیں جس کی وجہ سے مسلمانوں کو دشمنان اسلام سے جہاد کرنے کی اجازت دی گئی ہے لہٰذا حکم جہاد ظلم و ستم کو روکنے کے لئے ہے اصل اولی نہیں ہے جیسے قاعدہ سمجھ لیا گیا ہے۔

۱۔ سورہ حج/۳۹

۲۔ سورہ بقرہ/۱۹

۳۔ سورہ توبہ/۱۰۹

ب:۔ وہ آیات جو کفار کی دوستی سے منع کرتی ہیں

۱۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے:

﴿ لاَيَتَّخِذْ الْمُؤْمِنُونَ الْكَافِرِينَ أَوْلِيَاءَ مِنْ دُونِ الْمُؤْمِنِينَ وَمَنْ يَفْعَلْ ذَلِكَ فَلَيْسَ مِنْ اللهِ فِي شَيْءٍ ... ﴾[۱]

''مومنین، مومنین کو چھوڑ کے کافروں کو اپنا سرپرست نہ بنائیں اور جو ایسا کرے گا تو اس کا خدا سے کچھ سروکار نہیں۔

یہ آیت مسلمانوں کو ایک اہم سیاسی اور اجتماعی سبق دے رہی ہے کہ مسلمان، بیگانوں کو کسی بھی عنوان سے اپنا حامی اور مددگار نہ بنائیں ان کی چرب زبانی کا شکار نہ ہوں ان کی ظاہری دوستی و محبت کے دھوکہ میں نہ آئیں، تاریخ گواہ ہے، ہمیشہ ان کی انھیں چالبازیوں سے مومنین نے سخت نقصانات اٹھائے ہیں۔ [۲]

۲۔ دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے:

﴿ يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لاَتَتَّخِذُوا عَدُوِّي وَعَدُوَّكُمْ أَوْلِيَاءَ تُلْقُونَ إِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ وَقَدْ كَفَرُوا بِمَا جَائَكُمْ مِنْ الْحَقِّ يُخْرِجُونَ الرَّسُولَ وَإِيَّاكُمْ ... ﴾[۳]

''اے ایمان دارو اگر تم میری راہ میں جہاد کرنے اور میری خوشنودی کی تمنا میں (گھر سے) نکلتے ہو تو میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست نہ بناؤ تم تو ان کے پاس دوستی کا پیغام بھیجتے ہو اور جو دین حق تمھارے پاس آیا ہے اس سے وہ لوگ انکار کرتے ہیں وہ رسول کو اور تم کو اس بات پر (گھر سے) نکالتے ہیں کہ تم اپنے پروردگار پر ایمان لے آئے ہو''

اس بنا پر قرآن کی رو سے کفار و مشرکین کے ساتھ نرمی و مدارا جائز نہیں ہے یعنی مسلمان کافروں کے ساتھ جنگی حالت میں زندگی بسر کریں۔ لیکن اس دلیل کو اس طرح رد کیا جاسکتا ہے کہ وہ رفتار و کردار جس سے دنیائے اسلام کو نفع حاصل ہو اور اسلام کی طاقت و قوت اور اس کی ترقی کا سبب بنے نہ صرف جائز ہی نہیں بلکہ نہایت پسندیدہ اور ایک معقول بات بھی ہے۔ کفار سے مصالحت آمیز رویہ۔ اختیار کرنے کا مطلب دوستی نہیں بلکہ حق کی طرف

۱۔ سورہ آل عمران/۲۸، ترجمہ مولانا فرمان علی صاحب

۲۔ تفسیر نمونہ، ج/۲ص/۳۷۲

۳۔ سورہ ممتحنہ/۱، ترجمہ مولانا فرمان علی صاحب

انھیں بلانے کا ایک نیا انداز تبلیغ ہے جب کہ کسی کے ساتھ مسالمت آمیز زندگی گزارنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس کے عقائد وخیالات صحیح اور قابل قبول ہیں۔

نظریہ دوم: اصالت صلح

اس نظریہ کا مطلب یہ ہے کہ غیروں سے مسلمانوں کے روابط کی بنیاد صلح وآشتی اور نیکی و مدارا پر قائم ہے کیوں کہ پرامن ماحول میں ترقی کی رفتار بڑھ جاتی ہے افہام وتفہیم کے مواقع زیادہ ہوتے ہیں اور نتیجہ میں اسلام کی طرف دلوں کا جھکاؤ بھی بڑھ جاتا ہے یہی وجہ ہے کہنے والے نے کہہ دیا کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیس سال کی تبلیغ دعوت میں جتنے لوگ مسلمان ہوئے ہیں صلح حدیبیہ کے بعد اسلام لانے والوں کی تعداد اس سے کہیں زیادہ تھی۔[1]

اس نظریہ کے مطابق جنگ صرف خاص جگہوں کے لئے ہی تھی اور غیروں کے ساتھ مسلمانوں کے تعلقات کا انداز مصالحانہ اور زندگی معمول کے مطابق رہی ہے اور اسلام نے کبھی اپنے پیروکاروں کو غیر مذاہب کے ماننے والوں کے قتل وغارت کی چھوٹ نہیں دی ہے اور نہ تو اختلاف عقیدہ کسی سے دشمنی اور مخاصمت کی سند ہوسکتا ہے بلکہ اس کے برخلاف اسلام اپنے تابعین کو مخالفین کے ساتھ عدل وانصاف کرنے کا حکم دیتا ہے۔[2]

اور اس نظریہ کے بہت سے بزرگان دین اور اسلامی علماء قائل رہے ہیں، جس میں سے بعض کے نظریات یہاں پر ذکر کرتے ہیں:

۱:۔ حضرت امام خمینیؒ فرماتے ہیں:

''ہم لوگ بحیثیت تابع اسلام ہمیشہ جنگ کے مخالف رہے ہیں اور ہماری خواہش ہے تمام ممالک کے ساتھ دوستانہ رکھیں لیکن اگر ہمارے ملک پر جنگ تھوپی گئی تو پھر ہماری پوری قوم جنگ کرنے کے لئے اٹھ کھڑی ہوگی اور ہم پوری قوت سے دشمن کا مقابلہ کریں گے چاہے دنیا کی بڑی طاقتیں مل کر دشمن کی پشت پناہی کیوں نہ کر رہی ہوں'' [3]

۱۔ محمد حسن نجفی، نکتہ ھای در فقہ روابط بین الملل۔ مجلّہ فقہ، ش۱۰، سال۳ زمستان ۱۳۸۵

۲۔ ممتحنہ/۲۴

۳۔ در جستجوی راہ از کلام امام، جنگ و جہاد دفتر۲

۲:۔ علامہ شیخ جواد بلاغی فرماتے ہیں:

''رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی مسالمت آمیز اصول پر استوار تھی اور کفار جب بھی آپ سے صلح وآشتی کے ساتھ رہنے کی خواہش کرتے اپنی کامیابی اور غلبہ کا یقین رکھنے کے باوجود آپ ان کی اس پیشکش کو قبول کر لیتے تھے''۔۱

۳:۔ جناب شیخ صبحی محمصانی کا خیال ہے:

''اسلام کے فکری ونظری مبانی صلح ومصالحت کو بنیادی اصول شمار کرتے ہیں اور اس کے نزدیک نادر حالات واستثنائی مواقع کے علاوہ کہیں بھی جنگ روا نہیں ہے چنانچہ استاو فلیپ ہٹی، مشہور ماہر تاریخ عرب کہتے ہیں (مجھے یاد نہیں کہ عربوں نے حتی ایک شہر بھی بزور شمشیر فتح کیا ہو اور اگر رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد مسلمانوں نے ممالک پر حملے کئے ہیں تو یہ کوئی حکم دین نہیں تھا بلکہ تعلیمات اسلامی کے خلاف مسلمانوں کا (ذاتی) فعل تھا۔ ۲

دلائل اصالت صلح

۱۔ آیات قرآنی

قرآن مجید کی بہت سی آیتیں مسلمانوں کو صلح پسندی اور مصالحانہ زندگی کی دعوت دیتی ہیں۔۳

اسی طرح وہ آیتیں جو جہاد کا حکم دیتی ہیں ان کی روح بھی اسی نظریہ کی تائید میں ہے کیوں کہ آیات جہاد پر غور وفکر کرنے کے بعد یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ جہاد کرنے کی اجازت اسی وقت ہے جب صلح وامن کی راہیں مسدود ہو جائیں اور لڑائی کے اسباب فراہم ہوں۔

قرآن کریم متعدد آیات میں جنگ کی وجوہات بیان کرتا ہے اور تجاوز،۴ فتنہ گری، ۵ عہد شکنی کرنے

۱۔امر کابی، الجہاد فی الاسلام، ص۴۳ و۴۴

۲۔ صبحی محمصانی، القانون والعلاقات الدولیۃ فی الاسلام، ص۶۱۔ ۵۵

۳۔سورہ بقرہ/۲۰۸، انفال/۶۱، نساء/۹۰ و۹۴

۴۔بقرہ/۱۹۰

۵۔بقرہ/۱۹۳

والوں کی تنبیہ، [1] جنگ چھیڑنے والوں اور سازش کرنے والوں کو ناکام بنانے، [2] مظلوموں اور ستمدیدہ لوگوں کی فریادرسی، ارض وطن [3] کے دفاع وغیرہ کو جنگ کے دلائل و وجوہات شمار کرتا ہے اور ایسے مواقع پر مسلمانوں کو جنگ کی اجازت دیتا ہے۔

اس بنا پر جب تک جنگ کے حالات پیدا نہ ہو جائیں مسلمانوں کو جنگ شروع کرنے کی اجازت نہیں ہے۔

۲:۔ سنت

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا قول وعمل بھی اسی بات پر گواہ ہے کہ آپ نے کبھی جنگ کی شروعات نہیں فرمائی اور آپ کی سیرت صلح پسندانہ زندگی اور بقائے باہم کے اصول کی نشاندہی کرتی ہے، تاریخ اسلام کی تمام جنگی مہم دشمنان اسلام کی عہد شکنی اور ان کی دست درازی کو روکنے کے لئے دفاع کا حصہ رہی ہے جس میں آغاز جنگ کا پہلو نہیں دیکھائی دیتا۔ [4]

۳:۔ عقل

چوں کہ جنگ ایک ایسی چیز ہے جس کے شروع ہونے کے بعد جانی، مالی، اور سیاسی واجتماعی نقصانات ہوتے ہیں، دشمنیوں میں اضافہ ہوتا ہے، ارشاد وہدایت کی راہیں مسدود ہو جاتی ہیں اس لئے بذات خود یہ کوئی محبوب شے نہیں ہے اور نہ ہی کوئی عاقل انسان جنگ وجدال کو درست سمجھتا ہے۔ بلکہ اسے انسانی مصلحتوں کے خلاف جانتا ہے ہاں اگر جنگ کے علاوہ کوئی اور راستہ ہی باقی نہ رہے اور جنگ ناگزیر ہو جائے تو اسے روا سمجھا جاتا ہے۔ لہٰذا دوسروں کے ساتھ مصالحانہ زندگی گزارنے کے علاوہ کوئی اور راستہ ہی نہیں ہے جسے درست سمجھا جائے۔ جنگ و جدال تو صرف استثنائی حالات میں ہی جائز ہے ورنہ عام حالات میں اس کی کوئی شرعی حیثیت نہیں ہو سکتی۔

اسلامی ممالک میں غیر مسلمانوں کو اسلام کی طرف دعوت دینے کا عمل، اسلامی رافت ورحمت اور مہربانی کے ساتھ انجام پاتا رہا ہے، اور برادران اسلامی کا دیگر قومی اقلیتوں کے ساتھ زندگی کا انداز بھی مصالحانہ رہا ہے۔

۱۔ توبہ/۱۳

۲۔ نساء/۷۵

۳۔ حج/۳۹

۴۔ الرکابی، الجہاد فی الاسلام، ص/۳۶ و ۳۷

استاد مطہری اس سلسلہ میں گفتگو کرتے ہوئے کہ آیا اسلام دین صلح ہے یا جنگ؟ لکھتے ہیں:

''اسلام دین صلح بھی ہے اور دین جنگ بھی بعض حالات وشرائط میں لڑنا غلط ہے اور بعض حالات میں لڑائی ضروری ہے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی مدنی زندگی میں بعض مواقع پر جنگ کرتے ہوئے دیکھائی دیتے ہیں تو بعض مواقع ایسے ہیں جہاں صلح نامہ پر دستخط بھی کرتے ہیں۔[1]

مدارائے پیغمبر اکرمؐ کے بعض نمونے

جس نرمی و مدارا کی آیات وروایات میں جا بجا تاکید پائی جاتی ہے اور مسلمانوں کو اس کی سفارش کی گئی ہے، سیرت نبویؐ میں اس کا ایک خاص مقام ہے۔

صرف دیکھنا یہ ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کس کے ساتھ رفق و مدارات سے کام لیا ہے؟ اور آپ کی نیکی ورحمت کے زیر سایہ رہنے والوں کی کیا خصوصیات تھیں؟ کیا پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے رفق و مدارا سے فیضیاب ہونے والے افراد صرف مسلمان تھے؟ یا غیر مسلمان بھی آپ کی رحمت کے قابل تھے؟ اور اس سلسلہ میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کیا سیرت رہی ہے،؟

اس بنا پر جب ہم آیات وآحادیث کا اس پہلو سے جائزہ لیتے ہیں تو کہیں سے کوئی تفریق نہیں دیکھائی دیتی بلکہ سارے انسان برابر سے آپ کے لطف ومرحمت کے زیر سایہ نظر آتے ہیں سیرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم ہو یا بقیہ ائمہ اطہار علیہم السلام کی سیرت وکردار مسلمان وغیر مسلمان دونوں کے لئے ان حضرات کی سیرت و رفتار مساوی حیثیت رکھتی تھی اس لئے ہم یہاں پر رفتار وکردار پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کچھ نمونے بطور مثال پیش کرتے ہیں۔

مسلمانوں کے ساتھ پیغمبرؐ کا کریمانہ اخلاق

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسلمانوں سے رفق و مدارا کرتے اور ان سے شفقت ومحبت فرماتے تھے اور مسلمانوں کے ساتھ آپ کے حسن اخلاق کی مثالیں روز روشن کی طرح واضح ہیں کیوں کہ اسلام وایمان کا یہی تقاضا تھا۔

قرآن مجید پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کے اصحاب کی توصیف کرتے ہوئے فرماتا ہے:

۱۔ مرتضی مطہری، سیری در سیرہ ائمہ، انتشارات صدرا قم ص/۵۹

﴿ محمّد رسول اللّٰه و الذين معه اشداء علی الکفار رحماء بینهم ... ﴾[1]

''پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کے اصحاب کی ایک ممتاز صفت یہ ہے کہ، دشمنان خدا کے مقابلہ میں نہایت سخت مزاج اور آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ رؤف ومہربان ہیں''

اور یہ بات اس قدر روشن ہے کہ اس سلسلہ میں کوئی بحث وتکرار نہیں پائی جاتی، لیکن غیروں کے ساتھ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت ورفتار کا انداز کیسا تھا اور آپ دیگر قومی اقلیتوں کے ساتھ کس قسم کا برتاؤ کرتے تھے؟ یہ وہ موضوع ہے جو قابل بحث ہونے کے ساتھ بین الاقوامی دنیا میں اپنا خاطر خواہ اثر بھی رکھتا ہے۔

بیگانوں اور دینی ومذہبی اقلیتوں کے ساتھ سلوک ہی آج اقلیتوں کے حقوق کے نام سے موضوع بحث و گفتگو بنا ہوا ہے یہاں مخالفین کے ساتھ سیرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جاننے کے لئے یہاں پر ملاحظہ ہوں:

ہم کچھ موارد کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

مخالفین اسلام کے ساتھ پیغمبرؐ کا برتاؤ

الف)۔ یہودی

پہلا گروہ جو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عقائد کے خلاف تھا اور آپؐ ان کے ساتھ مسالمت آمیز طریقہ پر زندگی بسر کررہے تھے ان یہودیوں کا ہے جو مدینہ اور اطراف مدینہ میں پھیلے ہوئے تھے اور اوائل ہجرت جب پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وارد مدینہ ہوئے تو آنے کے بعد یہودیوں کے ساتھ مصالحانہ زندگی گزارنے کے لئے عہد وپیمان کیا لہٰذا تاریخ میں اس قسم کے دو معاہدے ملتے ہیں: ۱۔ معاہدہ عام، ۲۔ معاہدہ خاص

۱:۔ معاہدۂ عام: یہ معاہدہ ایک طرف سے مہاجرین وانصار اور دوسری جانب یہودیوں کے درمیان مسالمت آمیز زندگی گزارنے کے لئے منعقد ہوا تھا۔

۲:۔ معاہدۂ خاص: یہ وہ معاہدہ ہے جسے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہودیوں کے تین قبائل بنی نظیر، بنی قریظہ اور بنی قینقاع کے درمیان منعقد کیا تھا۔ مرحوم طبرسی ''اعلام الوریٰ'' میں علی بن ابراہیم سے اس کے سلسلہ میں نقل کرتے ہیں:

۱۔ سورہ فتح ۱۵/

اس معاہدہ کا مضمون بہت واضح اور روشن ہے جس سے اسلام کی صلح پسندانہ سیاست اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مصالحانہ رفتار کا اندازہ ہوتا ہے اسی معاہدہ کی وجہ سے سالہا سال اطراف مدینہ کے یہودی مسلمانوں کے ساتھ مسالمت آمیز زندگی گزارتے رہے جس کی وجہ سے ان کی جان و مال وعزت محفوظ تھی، اور مسلمانان مدینہ کا یہ مصالحانہ رویہ اس وقت تک باقی رہا جب تک کہ یہودیوں نے خود سے یک طرفہ یہ معاہدہ توڑ کر مشرکین سے رابطہ قائم نہ کرلیا اور مسلمانوں کے خلاف اعلانیہ خیانت اور سازشوں پر اتر آئے۔

ب)۔عیسائی

دوسرا گروہ عیسائیوں کا ہے جس کے ساتھ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نہایت صلح پسندانہ زندگی گزار رہے تھے اور یہ لوگ اس وقت جزیرہ نمای عرب اور اطراف کے ممالک میں گزر بسر کررہے تھے۔

جب کہ مسیحیوں کا خیال اس نئے دین کے بارے میں مثبت تھا انھیں اس دین سے کوئی دشمنی نہیں تھی، جزیرہ نمائے عرب کے عیسائی اور دیگر مناطق جیسے شام کے عیسائی اسلام کے شیدائی ہوگئے اور دل وجان سے اسے قبول کرلیا اور جو عیسائی اپنے مذہب پر باقی رہ گئے تھے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یا مسلمانوں نے انھیں عقائد تبدیل کرنے یا زبردستی اسلام قبول کرنے پر کبھی مجبور نہیں کیا لہٰذا مسیحیوں کے ساتھ مسلمانوں کا صلح پسندانہ انداز ڈھکا چھپا نہیں ہے بلکہ واضح اور روشن ہے اور ان کے بارے میں قرآن مجید کا انداز خطاب، پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جانب سے انھیں لکھے گئے خطوط محبت اور نرمی ومہربانی سے لبریز ہیں۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جن حکمرانوں کو دعوت اسلام دی ہے بیشتر مسیحی تھے جن میں بعض جیسے حبش کے بادشاہ نجاشی نے آپ کی دعوت کو قبول کرلیا اور بعض نے آپ کی دعوت ٹھکرا دی لیکن مجموعی طور پر ان عیسائی بادشاہوں کو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں آسمانی کتابوں میں پہلے دی گئی بشارت کا علم تھا لہٰذا جیسے ہی پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کوئی خط انھیں موصول ہوتا یہ لوگ اس کی تحقیق وجستجو کے لئے اپنے نمائندہ بھیجتے تھے تاکہ وہ علامات ونشانیاں جو پہلے سے کتابوں میں موجود تھیں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اندر دیکھیں اور اس تصدیق کریں۔ چنانچہ بعض وفود ایسے بھی تھے جنھوں نے آپ کے اندر یہ پیغمبرانہ نشانیاں دیکھنے کے بعد اسلام قبول کرلیا اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کی بصیرت ومعرفت کی وجہ سے انھیں عزت دی مگر جس گروہ نے اپنی جہالت وکٹ حجتی کی بنا پر اسلام قبول نہیں کیا آپ ان کے ساتھ مدارا کرتے رہے۔ تاریخ شاہد ہے۔ ہجرت کے دسویں سال نصارائے نجران پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خط وصول کرنے کے بعد جب آپ کی

خدمت میں مدینہ پہنچے اور ان کا وقت عبادت آ گیا تو آپ نے مسجد مدینہ میں ان کے آئین کے مطابق اس میں عبادت کی کھلی چھوٹ دی اور نصارائے نجران نے پشت بہ قبلہ مشرق کی جانب (بیت المقدس) کی طرف رخ کر کے بغیر کسی مزاحمت کے اپنے مراسم انجام دئے۔[1]

جب کہ مدینہ میں اسلامی حکومت کی بنیادیں مضبوط ہو چکی تھیں اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اقتدار وحکومت کے مالک تھے چاہتے تو بآسانی عیسائیوں کو تہہ تیغ کر دیتے یا ان سے زبردست ٹیکس وصول کرتے اور اسلامی عقائد کے خلاف کسی بھی مراسم سے انھیں روک دیتے مگر آپ نے قدرت وطاقت کے باوجود انھیں آزادی دی، ان کے ساتھ رفق ومدارا سے پیش آئے اور ان کے حقوق کا پورا پورا احترام کیا۔

ج)۔ مشرکین

ہر چند قرآن مجید کی بعض آیات مشرکین کو اہل کتاب کی صف سے جدا کرتی ہیں اور اہل کتاب کو امتیاز حاصل ہے لیکن اسلام کی انسان نوازی، رفق ومدارا کا کریمانہ انداز کہ۔ اسلام جس کا حکم دیتا ہے۔ تنہا اہل کتاب ہی کے لئے نہیں تھا بلکہ کفار ومشرکین بھی جب تک مسلمانوں کے خلاف لڑائی کے لئے نہیں اٹھے اور ان کے خلاف سازش نہیں کی اسلام کے اس نظام کریمانہ سے بہرہ مند ہوتے رہے اور فتح مکہ اس بات کی بہترین گواہ ہے جب ۸ھ میں سپاہیان اسلام آنحضرتؐ کی سرکردگی میں مکہ فتح کرنے کے بعد پورے مکہ پر قابض ہو گئے اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مشرکین سے خطاب کر کے فرمایا: تم لوگوں کو آج مجھ سے کس بات کی امید ہے؟ مشرکین نے یہ سن کر جواب دیا ''خیرا، اخ کریم وابن اخ کریم'' ہم آپ سے نیکی واچھائی کے علاوہ کوئی امید نہیں رکھتے کیوں کہ آپ ہمارے بزرگ بھائی اور عفو وبخشش کرنے والے بھائی کے عظیم المرتبت بیٹے اور صاحب اختیار ہیں۔[2]

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کا یہ بیان سن کر ارشاد فرمایا:

''میں تم لوگوں سے وہی کہتا ہوں جو میرے بھائی یوسف نے اپنے بھائیوں پر قابو پانے کے بعد فرمایا تھا ''**لا تثریب علیکم الیوم**'' آج کے دن تم لوگوں پر کوئی ملامت وسرزنش نہیں ہوگی، پھر حضرت نے اعلان کیا آج کا دن رحمت ومہربانی کا دن ہے انتقام لینے کا دن نہیں: ''**الیوم یوم المرحمة لا الملحمة**''

۱۔ سیرۃ ابن ہشام، ج ۴/، محمد باقر مجلسی، بحار الانوار، ج ۲۱/ص ۳۱۹/

۲۔ احمد بن ابی یعقوب، یعقوبی، تاریخ یعقوبی، ج ۲/ص ۶۰/

سعد بن عبادہ قبیلہ انصار کے ایک شجاع و بہادر مسلمان تھے وہ اپنے ہاتھ میں سیاہ پرچم لئے ہوئے، انھوں نے وارد مکہ ہوتے وقت آواز دینا شروع کی آج انتقام لینے اور دشمنوں کے خون بہانے کا دن ہے۔ مہاجرین میں سے کسی صحابی نے فوراً یہ خبر آنحضرت کو پہنچائی پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ خبر سننے کے بعد حضرت علی علیہ السلام کو حکم دیا کہ پرچم سعد کے ہاتھوں سے لے کر خود علمداری کی ذمہ داری سنبھالیں اور آپ نے بھی پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم کی تعمیل فرمائی۔[1]

اس طرح پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مکہ میں عام معافی کا اعلان کر کے جبر وتشدد کا سد باب کر دیا۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان لوگوں کو معاف کر دیا جنھوں نے آپ کو برسہا برس شدید شکنجہ میں رکھا تھا آپ کو اذیت پہنچائی تھی۔ آپ اور آپ کے اصحاب انھیں کے فشار کی وجہ سے مکہ چھوڑنے پر مجبور ہوئے تھے۔ بدر، احد، خندق اور دیگر خون آشام جنگیں انھیں قریش ہی نے آپ پر تھوپی تھیں جس کی وجہ سے اسلام اور مسلمین کو سخت جانی و مالی نقصانات اٹھانا پڑا تھا۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس پر اکتفا نہیں کی بلکہ ابوسفیان، اس کی بیوی ہندہ اور قاتل حمزہ سید الشہداء کو بھی معاف کر دیا اور سردار مشرکین مکہ ابوسفیان کے گھر کو لوگوں کے لئے جائے امن قرار دیا اور اعلان فرمایا جو ابوسفیان کے گھر میں داخل ہو جائے گا اس کی جان محفوظ رہے گی۔

۳:۔ منافقین

جو لوگ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر دل سے ایمان نہیں لائے انھیں دو گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

الف)۔ مخالفین کا وہ طبقہ جو اسلامی حکومت کے خلاف ہونے کے باوجود اسلامی حکومت گرانے کی کوشش میں نہیں تھا۔

ب)۔ مخالفین کا وہ گروہ جو مخالفت کے ساتھ ساتھ حکومت اسلامی کو نیست و نابود کرنا چاہتا تھا۔

الف):۔ جو مخالفین پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلاف تھے مگر اسلامی حکومت ختم کرنے کے خواہشمند نہیں

۱۔ سیرۃ ابن ہشام، ج ۴/ص ۴۹/، و ناصر مکارم و دیگران، تفسیر نمونہ، ج ۱۰/ص ۶۶/، ج ۲/ ص ۲۲۸/ نقل از تفسیر قرطبی، ج ۵/ص ۳۴۷۸/

۲۔ سیرۃ ابن ہشام، ج ۴/ص ۴۹/

تھے۔پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انھیں برداشت کیا ان کی جان مال وآبرو کو محترم قرار دیا اور کشادہ دلی سے ان کے ساتھ مدارا کرتے رہے کہ کہیں سے ان کے اندر بغض وعناد کی آگ نہ بھڑک اٹھے اور وہ کٹ حجتی نہ کریں۔ لہٰذا قرآن نے آپ کو حکم دیا: ﴿ خُذْ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنْ الْجَاهِلِينَ ﴾[1]

ب):۔حکومت گرانے کی کوشش کرنے والے منافقین

خود اسلام ابتدا میں دونوں گروہوں (جو مخالفت کے ساتھ نظام) ختم کرنا چاہتا ہے اور جو صرف مخالف) کے ساتھ مہربانی اور مدارا کرتا ہے اور ان سے انتقام لینے کی فکر میں نہیں ہے اور جو لوگ اسلامی حکومت کو نیست ونابود کرنا چاہتے ہیں انھیں اپنی اصلاح کے لئے مہلت دیتا ہے تاکہ وہ مخالفت سے ہاتھ اٹھالیں لیکن اگر وہ اس چھوٹ سے فائدہ اٹھانے کے بجائے فتنہ انگیزی اور سازش میں لگے رہتے ہیں تو انھیں تنبیہ کرتا ہے کہ اپنی اصلاح کی طرف توجہ دیں۔

رفق ومدارا کی حدیں

رفق ومدارا کا موضوع کیا ہے؟ اس کے حدود کیا ہیں؟ کیا یہ سب کے لئے یکساں اور ہر موقع ومحل کے لئے ہے؟ یا اس کی کوئی حد وانتہا بھی ہے؟ کیا اصول وعقائد کے دائرہ میں سہل انگاری اور مدارا کی گنجائش ہے؟ یا ایسی گنجائش نہیں ہے؟ اگر اسلامی معاشرے میں، اسلامی اقدار کے برخلاف رفتار وکردار رکھنے والے اپنے افکار و خیالات پھیلا رہے ہوں تو کیا انھیں آزادی دے دی جائے اور ان کا مقابلہ نہ کیا جائے؟ چاہے وہ لوگ معاشرے میں اپنے باطل عقائد پھیلاتے رہیں۔کیا ایسی آزادی کا مطلب امر بالمعروف ونہی عن کی مخالفت نہیں ہے؟

مدارا اور مداہنہ (چاپلوسی وخوش آمد) میں کیا فرق ہے؟ قرآن مجید مداہنہ کی کیوں مذمت کرتا ہے؟ یہ ایسے سوالات ہیں جو غور وفکر کے ساتھ مناسب جواب بھی چاہتے ہیں۔

۱:۔ سیرت نبوی میں شدت اور مدارا کا معیار؟

جہاں سیرت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں مدارا کی مثالیں پائی جاتی ہیں وہیں شدت اور صلابت بھی نظر آتی ہے ایسا نہیں ہے کہ آپ دشمنان اسلام کے ساتھ ہمیشہ رفق ومدارا ہی کرتے رہے ہوں اور کبھی شدت اختیار نہ کی ہو بلکہ بحیثیت انسان کامل آپ کے نزدیک ہر عمل کا ایک معیار تھا اور رفتار وکردار میں ایک توازن و

۱۔اعراف/۱۹۹

اعتدال پایا جاتا تھا۔ ایسا نہیں کہ اگر آپ کسی سے خوش ہو گئے تو اس پر بلاوجہ مہربان ہو جائیں اور اگر کسی سے کوئی ناراضگی ہو تو اس کے ساتھ دشمنی پر اتر آئیں بلکہ آپ کی پوری حیات اصول و معیار کے مطابق تھی۔

آپ کا خاصہ یہ تھا کہ اپنے ذاتی معاملات اور انفرادی امور میں اور ہر اس جگہ پر جہاں اسلام کے اصول و مبانی سے ٹکراو پیش نہ آتا ہو وہاں مدارا تا اور چشم پوشی سے کام لیتے تھے۔ لیکن اسلام کے مسلمہ اصول و عقائد، مصالح اسلامی، ضروریات دین و احکام شریعت اور قانون الٰہی میں بال برابر بھی کسی کی کوئی پرواہ نہیں کرتے بلکہ ایسے مقامات پر اپنے فریضہ منصبی کی ادائیگی کے لئے صلابت اور سختی فرماتے تا کہ احکام الٰہی کے نفاذ میں ذرہ برابر بھی رخنہ ایجاد نہ ہونے پائے۔

آپ نے فتح مکہ کے موقع پر قریش پر غلبہ حاصل کرنے کے بعد ان کی تمام بدرفتاری کو معاف کر دیا جو انھوں نے بیس سال تک آپ کے ساتھ روا رکھی تھی۔ اپنے دل پر پتھر رکھ کر اپنے چچا حمزہ کے قاتل تک کی توبہ قبول کر لی اور سخت سے سخت ترین دشمنوں کو معاف کر دیا لیکن اس فتح مکہ کے موقع پر جو لوگ دائرہ اسلام سے خارج ہو کر مرتد ہو گئے تھے ان کے قتل کا حکم بھی دیا۔[1] اسی طرح پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے چوری کا جرم ثابت ہونے کے بعد بنی مخزوم کی ایک عورت کے ہاتھ کاٹنے کا حکم دے دیا جب کہ اس کے اہل خاندان پوری کوشش میں تھے کہ کسی طرح پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس حکم کو واپس لے لیں مگر آنحضرتؐ نے حکم الٰہی کے نفاذ میں اس مطالبہ کا مطلق خیال نہیں کیا اور حکم جاری کر کے رہے۔[2]

اس بنا پر دشمنوں کے ساتھ صرف رفق و مدارا نہیں ہے بلکہ اس کا ایک معیار ہے اور اس کے حدود و شرائط ہیں جنھیں آیات اور سیرت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اخذ کیا جا سکتا ہے۔

۲:۔ مخالفین اور دشمنوں کے ساتھ مدارا کے حدود و شرائط

الف: مصلحت کی رعایت

احکام شرع کی بنیاد مصالح و مفاسد پر قائم ہے جو ہر موضوع میں پیش نظر ہوتے ہیں اور ہر حکم الٰہی قطعی طور پر اسی کے تابع ہوتا ہے لہٰذا ایسا کوئی شریعت کا حکم نہیں ہے جس میں اس کی مصلحت اور فساد ملحوظ خاطر نہ ہو۔ دراصل

۱۔ ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ، ج ۳/ص ۵۶۴/۵۶۳

۲۔ مرتضیٰ مطہری، وحی و نبوت، ص ۲۲۹/

ہر وہ کام جس میں معاشرہ کی مادی ومعنوی دونوں طرح کی صلاح پائی جائے اسی کو مصلحت کہتے ہیں۔علمائے فقہ شیعہ کے مطابق مصلحت کی دو قسمیں بیان کی ہے:

۱۔مصلحت ثابتہ (ثابت واستوار)

۲۔مصلحت غیر ثابتہ (ناپائدار وغیر ثابت)

۱:۔ جو قوانین رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جانب سے بعنوان ''وحی'' لوگوں تک پہنچے ہیں وہ سارے قوانین پائدار مصلحت کے حامل ہیں، اوران میں کسی تغیر وتبدل کی گنجائش نہیں پائی جاتی۔

۲:۔بعض قوانین مستقبل کو مدنظر رکھ کر زمانے کے تقاضے کے تحت صادر ہوئے ہیں جس کی ایک وقتی مصلحت ہے یہ قوانین اسی زمانے تک واجب ہیں جب تک اس کی مصلحت کا تقاضا ہے لہٰذا اس جیسے قوانین کہ غیر ثابت کہا جاتا ہے۔

اسلامی طرز تفکر کے مطابق جب تک نرمی و مدارا سے کام لینا ممکن ہو سختی اور شدت پسندی کرنا مناسب نہیں ہے اس لئے کہ اسلام نرمی ومہربانی کو مقدم قرار دیتا ہے اور جبر وتشدد اس کے بعد کا مرحلہ ہے وہ اپنے مخالفین کو جبر وتشدد اختیار کر کے اپنے پاس سے دور کرنے کے بجائے ارشاد و ہدایت کی ذریعہ انھیں اپنی طرف کھینچتا ہے۔ اسلام تعلیم وتربیت کا قائل ہے اور اہل مذاہب کے درمیان لڑائی جھگڑے کے بجائے گفتگو اور مذاکرہ کی پیش کش کرتا ہے اور آپس میں مل جل کر رہنے کی دعوت دیتا ہے تا کہ اس طرح ہر تخریبی عمل اور جبر وتشدد کی جڑ کاٹ سکے۔

ب)۔ قانون امر بالمعروف ونہی از المنکر

دشمنان اسلام کے ساتھ رفق و مدارا اسی وقت تک کے لئے پسندیدہ بات ہے جب کہ قانون امر بالمعروف کو ٹھیس نہ پہنچتی ہو اور کسی منکر کے انجام پانے کا سبب نہ بنے۔

جو لوگ اہل کتاب کے ساتھ مدارا کو قانون امر بالمعروف سے ٹکراؤ سمجھ کر اعتراض کرتے ہیں ان کا اعتراض یہ درست نہیں ہے کیوں کہ اسلام اور سیرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں کسی کے ساتھ نیکی و مدارا اسی وقت تک صحیح ہے جب تک اقدار اسلامی اور اس کے اصول وضوابط کو نقصان نہ پہنچتا ہو اور مدارا کا عمل اسلامی

۱۔سورہ آل عمران/۶۴

معاشرے کی مصلحت رکھتا ہو۔ لہٰذا دشمنوں کے ساتھ نیکی و مدارا کی وجہ سے اگر کوئی نیکی ترک ہو جائے یا کسی برائی (منکر) کا رواج ہوتا ہو تو پھر ایسا مدارا غیر قابل قبول ہے اور ایسی جگہ سہل انگاری کی کوئی گنجائش نہیں پائی جاتی۔

ج)۔ قانون تولا و تبرا متروک نہ ہونے پائے۔

د)۔ مدارا دین میں کسی سمجھوتہ کا سبب نہ بننے پائے۔

قرآن کریم رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دین کے اصول و قوانین میں کفار و مشرکین سے سمجھوتہ کرنے سے روکتا ہے اور کافرین و اہل کتاب سے مداہنہ اور مجاملہ کو ان کی اطاعت و پیروی قرار دیتا ہے قرآن کے نزدیک مدارا اور دین کے معاملہ میں کفار سے مداہنہ (سمجھوتہ) کے مفہوم میں فرق پایا جاتا ہے عربی میں ''مداہنہ'' کی اصل ''دہن'' ہے جس کا تعلق داہنیہ سے ہے یعنی مکھن لگانا وغیرہ قرآن کا ارشاد ہے ''ودوا لو تدھن فیدھنون'' [1] وہ لوگ یہ چاہتے ہیں کہ اگر تم نرمی اختیار کرو تو وہ بھی نرم ہو جائیں۔

استاد مطہری دین میں سہل انگاری کا مفہوم ادہان ہی سے سمجھتے ہیں اور معتقد ہیں کہ قرآن سہل انگاری کی اجازت نہیں دیتا یعنی قرآن مجید غیر مسلمانوں کے ساتھ دین کے معاملہ میں کسی سمجھوتہ کا قائل نہیں۔ [2]

۳۔ قہر و غضب کے موارد

یہ درست ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے دشمنوں اور مخالفین کے ساتھ حتیٰ الامکان رفق و مدارا کو ترجیح دیتے تھے لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ مدارات کی کوئی حد نہیں ہے بلکہ اس کی بھی ایک حد و انتہا ہے یعنی جو اسلام غیروں کے ساتھ نرمی و مہربانی کرنے کا حکم دیتا ہے وہی بوقت ضرورت سختی اور صلابت سے کام لینے کا بھی حکم دیتا ہے۔

اسلامی نقطۂ نظر سے لوگوں کے حقوق کو پائمال کرنے والے اشخاص امن و سکون کو چیلنج کرنے والے لوگ دشمنوں سے مل کر سازش رچانے والے تخریبی عناصر اور عوام الناس کی جان و مال و عزت سے کھلواڑ کرنے والوں کے ساتھ نرمی اور رعایت برتنا گناہ اور جرم شمار ہوتا ہے جس کی کسی قیمت پر اجازت سے نہیں ہے البتہ شدت پسندی اور سختی کا برتاؤ خود اپنی جگہ ایک اعتباری و اضافی چیز ہے جس کے اچھے یا برے ہونے کا فیصلہ ضرورت و وقت کو مدنظر

۱۔ سورہ قلم/۹ ترجمہ مولانا فرمان علی صاحب

۲۔ فصل نامہ نقد، ش۱۴و۱۵، ص/۳۵۴

رکھ کر ہی کرنا چاہئے کیوں کہ ہر جگہ نہ سختی بری ہوتی ہے اور نہ ہی نرمی کو ہر جگہ ایک قانون سمجھا جا سکتا ہے بلکہ دونوں کا اپنا اپنا مقام اور مناسب محل ہے۔ لہٰذا ہم یہاں پر ان بعض اہم موارد کی طرف اشارہ کرتے ہیں جہاں پر اسلام نے سختی کو واجب و لازم جانا ہے اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قدرت و طاقت کا سہارا لے کر نرمی سے پرہیز فرمایا ہے۔

الف)۔ تجاوز کرنے والوں سے مقابلہ کا حکم

جب اسلام پر حملہ ہونے لگے یا اسلامی سرزمین دشمنوں کے مسلحانہ تجاوز کا شکار ہو جائے تو یہاں پر دشمنوں سے جہاد کرنا واجب ہے اور یہ وہ پہلا موقع ہے جہاں نرمی و مہربانی کا کوئی جواز نہیں پایا جاتا۔

جن لوگوں نے جنگ کا آغاز کیا ہے اور مسلمانوں پر حملہ آور ہوئے ہیں اسلام مسلمانوں کو ایسے افراد سے جہاد کرنے کا حکم دیتا ہے۔[1] کیوں کہ ان کے مقابلہ میں ذرہ برابر نرمی اور کوتاہی حرام ہونے کے ساتھ ایک عظیم جرم شمار ہوتا ہے۔

ب)۔ فتنہ گروں کے ساتھ جہاد کرنے کا حکم

جب فتنہ کرنے والے اسلامی معاشرہ میں فتنہ برپا کریں اور معاشرہ کو بدامن کرنے کی کوشش میں لگے ہوں تو ایسے موقع پر ان کا شدت سے مقابلہ لازم ہے لہٰذا جہاں ظلم و تشدد ختم کرنے کی بات ہو بلوائیوں کو کچلنے اور فتنہ کی آگ[2] بجھانے کا مسئلہ ہو وہاں نرمی اور تساہلی کی اجازت نہیں ہے۔ بلکہ ایسی جگہ نرمی و مہربانی کا مطلب ہی ختم ہو جاتا ہے۔

ج)۔ قانون شکنی کرنے والوں سے مقابلہ کا حکم

خداوند عالم کا فرمان ہے کہ جو لوگ قانون الٰہی کو توڑتے ہیں اور اس کا پاس و لحاظ نہیں رکھتے ان سے مقابلہ کرنا واجب ہے ارشاد ہوتا ہے:

۱۔ حج/۳۹، انفال/۶۱، محمد/۳۵، بقرہ/۱۹۲۔۱۹۰۔۱۹۳۔۲۸۰، نساء/۹۰۔۹۱۔۹۴، ممتحنہ/۸۔۹

۲۔ حج/۴۰، بقرہ/۱۹۱

﴿ قَاتِلُوا الَّذِينَ لَايُؤْمِنُونَ بِاللهِ وَلَابِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَلَايُحَرِّمُونَ مَا حَرَّمَ اللهُ وَرَسُولُهُ وَلَايَدِينُونَ دِينَ الْحَقِّ مِنْ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ حَتَّى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَدٍ وَهُمْ صَاغِرُونَ ﴾[1]

''اہل کتاب میں سے جولوگ نہ تو دل سے خدا ہی پر ایمان رکھتے ہیں اور نہ روز آخرت پر اور نہ خدا اور اس کے رسول کی حرام کی ہوئی چیزوں کو حرام سمجھتے ہیں اور نہ سچے دین ہی کو اختیار کرتے ہیں ان ولوگوں سے لڑتے جاؤ یہاں تک کہ وہ لوگ ذلیل ہوکر (اپنے) ہاتھ سے جزیہ دیں''

مسلمانوں کو اس آیت میں ادیان کی پیروی کرنے والے ان لوگوں سے جو خدا و آخرت پر ایمان نہیں لاتے اور خود اپنے ہی دین میں موجود الٰہی قانون کو با آسانی توڑتے ہیں اور اس کی رعایت نہیں کرتے ان سے لڑنے کا حکم دیا گیا ہے۔

د)۔منافقوں کی سازشوں سے مقابلہ کا حکم

ایک اور مقام پر جہاں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سختی کی ہے اور ذرہ برابر نرمی مدارا سے کام نہیں لیا ہے وہ ہے منافقین اور ان کی فتنہ پیروری کا مقابلہ، اسلام کے خلاف سازش اور اسلامی معاشرے سے چین وسکون ختم کرنے کی ان کی کوشش کا خاتمہ، تاریخ گواہ ہے کہ منافقین مدینہ نے اسلام کے خلاف سازش اور فتنہ برپا کرنے کی غرض سے ایک مسجد تعمیر کی پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو وحی کے ذریعہ ان کی اس ناپاک نیت کا علم ہوگیا لہٰذا آپ نے اس مسجد کو گرانے کا حکم دے دیا کہ جسے مسجد ضرار کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ [2]

ھ)۔حدود الٰہی کا اجراء

اسلام قانون الٰہی کے نفاذ اور حدود الٰہی کے اجراء کے مواقع پر نرمی اور ملاطفت سے منع کرتا ہے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قانون کے نفاذ کے سلسلہ میں ذرہ برابر نرمی سے کام نہیں لیتے تھے۔

۱۔سورہ توبہ/۲۹ ترجمہ فرمان علی صاحب

۲۔۔توبہ/۱۰۷، محمد باقر مجلسی، بحار الانوار ج/۲۱ ص/۲۵۳۔۲۵۴

سیرت نبوی میں رفق و مدارا کے تربیتی آثار

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت پاک اٹھا کر دیکھئے تو اس میں آپ کے بلند و عالی اخلاق کے سیکڑوں نمونے دیکھائی دیں گے جن کے مثبت آثار و نتائج مسلمانوں کے لئے ہمیشہ باعث برکت رہے ہیں۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات گرامی مکمل اخلاق اور نیک رفتار و کردار کا مثالیہ تھی جیسا کہ قرآن مجید آپ کی اس امتیازی خصوصیت کی طرف ''و انک لعلی خلق عظیم'' کی تعبیر سے اشارہ کرتا ہے اور آج بھی آپ کی اسی پاکیزہ سیرت کے اہم ترین تربیتی اور سیاسی آثار و نتائج کے نمونے تاریخ میں جا بجا دیکھائی دیتے ہیں۔

۱۔امت کی وحدت و یکجہتی کا ذریعہ

قرآن کریم پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحمت و محبت کو اس طرح سراہتا ہے:

﴿ فَبِمَا رَحْمَةٍ مِنْ اللهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللهِ إِنَّ اللهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِينَ ﴾[1]

''(تو اے رسول یہ بھی) خدا کی ایک مہربانی ہے کہ تم (سا) نرم دل (سردار) ان کو ملا اور اگر تم بدمزاج اور سخت دل ہوتے تب تو یہ لوگ (خدا جانے کب کے) تمھارے گرد سے تتر بتر ہو گئے ہوتے پس (اب بھی) تم ان سے درگزر کرو اور ان کے لئے مغفرت کی دعا مانگو اور ان سے کام کاج میں مشورہ لیا کرو مگر اور جب کسی کام کو ٹھان لو تو خدا ہی پر بھروسہ رکھو کیوں کہ جو لوگ خدا پر بھروسہ رکھتے ہیں خدا ان کو ضرور دوست رکھتا ہے۔

۲۔اسلام کی جانب لوگوں کے اقبال کا سبب

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحم دلی اور نرمی کے آثار و نتائج پہلی بار حدیبیہ میں فتح مکہ کے موقع پر دیکھائی دیئے جب مشرکین مکہ نے آپ کے کریمانہ اخلاق اور عام معافی کے اعلان کا مشاہدہ کیا اور بتعبیر قرآن

۱۔آل عمران/۱۵۹، ترجمہ مولانا فرمان علی صاحب

آپ کے اخلاق سے متاثر ہوکر گروہ در گروہ دین اسلام میں داخل ہونے لگے۔[۲] اور سب کے سب آپ کے سامنے سلیم ہوگئے۔

نتیجہ بحث

آیات قرآن، احادیث اسلامی اور سیرت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مطالعہ کے بعد یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ آسمانی دین کے پیروکاروں، دشمنان اسلام اور مخالفین پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ نرمی ومہربانی ایک اصل اوّلی ہے۔

لیکن یہ اصل اولی مطلق نہیں ہے یعنی اس کی بھی ایک حد ہے جب تک غیروں سے رواداری اور رفق و مدارا کا یہ عمل مسلمات دین، اسلامی اصول وعقائد سے نہ ٹکرائے اس کی گنجائش پائی جاتی ہے لیکن جہاں دین سے ٹکراؤ کی صورت پیدا ہونے لگے وہیں سے یہ قانون لغو ہوجاتا ہے اس لئے کہ دینی معاملات میں کسی سمجھوتے کی کوئی گنجائش نہیں پائی جاتی۔

اسی طرح اگر مسلمانوں کی سرزمین پر حملہ ہو، قانون خداوند کو توڑا جائے یا الٰہی قانون کے نفاذ میں رکاوٹ ایجاد کی جائے تو ایسی صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لئے نرمی کرنا گناہ ہے بلکہ ایسے لوگوں کا منہ توڑ جواب دینا واجب ہے مختصر یہ کہ صلح وجنگ دونوں کے اپنے خاص شرائط اور اصول وقوانین ہیں لہٰذا جہاں مصلحت اسلامی صلح کا تقاضا کرتی ہے وہاں صلح ہوگی اور جہاں مصلحت جنگ کا تقاضا کرتی ہے وہاں جنگ کی جائے گی۔

۱۔سورہ فتح/۲

فہرست منابع

۱۔قرآن

۲۔نہج البلاغہ

۳۔ابن قدامہ،موفق الدین عبداللہ ابن احمد المغنی، ج ۱/، دار الکتاب العربی، بیروت

۴۔الجوہری، الصحاح، ج ۴/، دار العلم بیروت، ۱۴۰۷ھ

۵۔الحرانی ابن شعبہ، تحف العقول، انتشارات اسلامی، قم

۶۔الحسینی العاملی، محمد جواد، مفتاح الکرامہ فی شرح القواعد، ج ۷/، چاپ اول ۱۴۱۹، موسسہ نشر اسلامی جامعہ مدرسین، قم

۷۔الاحسایی، ابن ابی جمہور، غوالی اللئالی ج ۱/، مبعہ شہداء، قم ۱۴۰۳ھ

۸۔الرکابی، الجہاد فی الاسلام، دمشق، دار الفکر، ۱۴۱۸ھ

۹۔الطبری، امین الاسلام ابی علی الفضل بن حسن، مجمع البیان، ج ۲/، موسسہ الاعلمی للمطبوعات، بیروت

۱۰۔العسکری، ابو ہلال، الفروق اللغویہ، موسسہ نشر الاسلامی (جامعہ مدرسین)، چاپ اول ۱۴۱۲ھ

۱۱۔اللیثی الوسطی، علی بن محمد عیون الحکمۃ والمواعظ چاپ اول ۱۳۷۶، ناشر دار الحدیث، قم

۱۲۔المقدسی، شمس الدین ابن قدامہ، الشرح الکبیر ج ۱/ دار الکتاب العربی، بیروت

۱۳۔الیاس، انطون، مترجم مصطفیٰ طباطبائی، فرہنگ نوین کتاب فروشی اسلامیہ، ۱۳۷۰، تہران

۱۴۔بغدادی، محمد ابن حبیب المحبر

۱۵۔بلاذری، احمد بن یحی بن جابر، فتوح البلدان، دار الفکر، بیروت ۱۴۱۲

۱۶۔بہزادی، حمید، نشریہ دانشکدہ حقوق وعلوم سیاسی، اصول وروابط بین الملل وتحولات آن در اسلام، ش ۱۲، سال ۱۳۵۱

۱۷۔خوانساری، آقا جمال، شرح غرر الحکم، بہ تصحیح جلال الدین محدث ارموی، ج ۴/

۱۸۔ درجستجوی راہ از کلام امام، جنگ و جہاد، دفتر ۲، تہران، امیر کبیر ۱۳۶۱
۱۹۔ دہخدا علی اکبر، فرہنگ دہخدا، ج ۲۶/ تہران، ۱۳۴۶
۲۰۔ سیرہ ابن ہشام ج ۲/، ۳، ۴ چاپ ۱۳۸۳ ناشر مکتبہ محمد علی صبیح واولادہ، بیروت
۲۱۔ طبرسی، علی بن فضل، اعلام الوری باعلام الھدی، ج ۱/ موسسہ آل البیت، قم ۱۴۱۷
۲۲۔ طریحی، فخر الدین، مجمع البحرین، ج ۲/ چاپ دوم ۱۴۰۸، مکتب نشر الثقافہ الاسلامیہ
۲۳۔ عاملی، حر، محمد بن حسن وسائل الشیعہ (الاسلامیہ) ج ۸/ ناشر دالاحیاء التراث العربی، بیروت
۲۴۔ فصل نامہ نقد، ش ۱۴ و ۱۵ موسسہ فرہنگی دانس واندیشہ معاصر، تہران، ۱۳۷۹
۲۵۔ کلینی، محمد بن یعقوب، اصول کافی ج ۲/، چاپ چہارم ۱۳۶۵ ناشر دار الکتب الاسلامیہ تہران
۲۶۔ مجلسی، محمد باقر، بحار الانوار ج ۹۵/، ۲، ۷، ۶۶، ۲۱ چاپ دعم ۱۴۰۳ھ موسسہ وفا بیروت
۲۷۔ محمد خاتم پیامبران، ج ۱/
۲۸۔ محمد بن عبد القادر، مختار الصحاح، دار الکتب السلامیہ، بیروت ۱۴۱۵
۲۹۔ محمصانی، صبحی، القانون والملافات الدولیہ فی الاسلامیہ، دار لاملایین بیروت ۱۳۹۲
۳۰۔ مطہری، مرتضی، وحی نبوت، انتشارات صدرا، ۱۳۶۸، قم
۳۱۔ مطہری، مرتضی، سیری در سیرہ ائمہ، انتشارات صدرا ۱۳۶۸، قم
۳۲۔ معین محمد، فرہنگ معین، ج ۲/ موسسہ امیر کبیر تہران ۱۳۸۳
۳۳۔ مکارم ودیگران، تفسیر نمونہ ن ۲/، ۱۰، ۱۴، ۲۰، دار الکتب الاسلامیہ ۱۳۷۰
۳۴۔ نجفی، محمد حسن، نکتہ ھای در فقہ روابط بین الملل مجلّہ فقہ، ش ۱۰ سال ۳ زمستان ۱۳۸۵
۳۵۔ نہج الفصاحہ، حدیث ۴۲۸۶، ترجمہ ابراہیم احمدیان، چاپ دفتر تبلیغات ۱۳۸۵
۳۶۔ یعقوبی، احمد بن ابی یعقوب، تاریخ یعقوبی، ج ۲/ مبعہ دار صادر، بیروت

عبداللہ بن سبا کی حقیقت، ایک تحقیقی جائزہ

ڈاکٹر سجاد علی استوری (استاد شعبہ علوم اسلامی، جامعہ کراچی)

خلاصہ:

عبداللہ بن سبا تاریخ کی ایک فرضی شخصیت گزری ہے جس کو ایک ہی راوی سیف بن عمر نے روایت کیا اور اس روایت کو سب سے پہلے مشہور مورخ طبری نے نقل کیا جس کے بعد ابن سبا کی شخصیت تاریخ کا حصہ بن ہے اگر ابن سبا کے وجود کو تسلیم بھی کیا جائے تو اس کو مذہب تشیع سے منسلک کرنا صحیح نہیں ہے کیوں کہ اس سے منسوب عقائد غیر اسلامی ہیں جس کا مذہب تشیع سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ بغدادی نے اس شخص سے منسوب فرقہ کو اہل غلاۃ میں شمار کرتے ہوئے اس کو کافر قرار دیا ہے اسی طرح علم رجال کے ماہرین علماء نے بھی اس شخص کو غالی اور کافر قرار دیا ہے۔

تاریخ اسلام کی قدیم اور جدید کتب میں ''عبداللہ بن سبا'' نامی شخص کا ذکر کثرت کے ساتھ ملتا ہے اور یہ شخص صدیوں سے مسلمانوں کے درمیان اختلاف کا باعث رہا ہے۔ ایک طرف بعض مورخین اس شخص کے بارے میں تفصیلات فراہم کرتے ہیں اور اس کو مذہب تشیع سے منسوب کرتے ہیں تو دوسری طرف مذہب تشیع کے ماننے والے اس شخص کے وجود کے منکر نظر آتے ہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ تمام تر نظریاتی وابستگیوں سے بالاتر ہو کر اس

پر تجزیہ کیا جائے اور اس شخص کی حقیقت کو جاننے کی کوشش کی جائے۔

عبداللہ بن سبا کے بارے میں جو باتیں مورخین نقل کرتے ہیں اس کا خلاصہ یہ ہے کہ شیعیت کا وجود پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور شیخین کے زمانے میں نہ تھا لیکن خلیفہ سوم حضرت عثمانؓ کے زمانے میں ایک یہودی شخص عبداللہ ابن سبا نے اسلام کا اظہار کیا اور مسلمانوں کو علی ابن ابی طالب کرم اللہ وجہہ کی بیعت کرنے کی دعوت دی اور علی بن ابی طالب کی خلافت کو پھیلانے کی کوشش کی۔ بہت سارے مسلمان اس کی پیروی میں آ گئے، جن کا نام شیعیان علی پڑ گیا۔ اس قصے کو مشہور مورخ خطیب بغدادی نے یوں خلاصہ کیا ہے۔

" کان ابن السوداء فی الاصل یهودیاً من اهل الحیرَة فاظهر الاسلام، واراد ان یکون له عنداهل الکوفةسُوقٌ ورئاسة، فذکر الهم انه وَجَدَ فی التوراة ان لکل نبی وصیاً، و ان علیاً رضی الله عنه وصیُ محمدِصلی الله علیه و آله و سلم انه خَیْرُ الاوصیاء کما ان محمداً خیر الانبیاء، فلما سمع ذلک منه شیعة علی قالوا لعلی: انه من محِبِّیک، فرفع علیُ قدره، و اجلسه تحت درجة منبرة، ثُم بلغه غُلُوُّهُ فیه فهمّ قتله، فنهاه ابنُ عباس عن ذلک و قال له: ان قتله اختلف علیک اصحابکَ، و انت عازم علی العَود الی القتال اهل الشام، و تحتاج الی مُداراة اصحابک، فلما خشی من قتله و من قتل ابن سبا الفتنَةَ التی خافَها ابنُ عباس نفاهما الی المدائن، فافتَنَ بهما الرعاع بعد قتل علی رضی الله عنه، و قال لهم ابن سوداء: واللّه لینبعن لعلی فی مسجد الکوفة عَینَان تفیض احداهما عَسَلاً و الاخریٰ سَمُناً، و یغترف منهما شیعة. [1]

لیکن شیعوں کا نظریہ ہے کہ بنی ہاشم کو اللہ کی طرف سے امت کی امامت کرنے کا حق ملا تو خاندانی

رقابتوں کی وجہ سے بنوامیّہ کے نامور شخصیتیں بنوھاشم کی اس قدر ومنزلت کو قبول کرنے کیلئے تیار نہیں ہوئیں اور بنی ہاشم اوران کے ماننے والوں کے خلاف سازشیں شروع کردیں اور یہ قصہ بھی ان سازشوں میں سے ایک ہے۔ جیسے کہ نامور عالم ڈاکٹر طٰہٰ حسین مصری لکھتے ہیں۔ ''اموی اور عباسی دور میں شیعوں کے مخالفین نے عبداللہ ابن سبا کے معاملے میں بڑے مبالغے سے کام لیا ہے تا کہ ایک طرف بعض ان واقعات کو مشکوک قرار دیا جائے جو حضرت عثمان ؓ اوران کے بنائے ہوئے حکام کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں اور دوسری طرف حضرت علی کرم اللہ وجہہ اوران کے شیعوں کی برائی کی جائے اوران کے بعض خیالات کی بنیاد ایک ایسے نومسلم یہودی کو قرار دیا جائے جو مسلمانوں کو فریب دینے کیلئے مسلمان بنا تھا۔ یہ ابن سبا محض فرضی شخصیت ہے جسے شیعوں کے مخالفین نے انہیں بدنام کرنے کے لئے تخلیق کیا ہے اور جو کچھ بیان کیا جاتا ہے حقائق اس کے برعکس ہیں۔'' (۲)

یہی مصنف اپنی ایک اور تصنیف میں رقم طراز ہیں۔ ''میرے نزدیک تو ابن سبا ایک وہمی وجود ہے اور اگر وہ کوئی تھا تو بالکل معمولی اور نا قابل ذکر، نہ ایسی شخصیت جس کی تصویر مورخین نے عہد عثمانؓ میں کھینچی اور جس کی سرگرمیوں کا نقشہ حضرت علی بن ابی طالب کے ابتدائی دور خلافت میں پیش کیا ہے، ابن سبا کو تو مخالفین شیعہ نے صرف شیعہ کے لئے تراشا ہے۔'' (۳)

عبداللہ بن سبا ایک افسانوی کردار کا نام ہے یا ایک حقیقی شخصیت کا نام ہے، یہ ایک اختلافی موضوع ہے جو تحقیق طلب ہے لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ اس شخص کے بارے میں بعض قدیم اور اکثر جدید مورخین نے جو معلومات فراہم کی ہیں، ان میں سب سے اہم یہ ہے کہ اس شخص سے منسوب ایک فرقہ ''سبائیہ'' کا تذکرہ بھی کثرت سے ملتا ہے، اگر عبداللہ بن سبا کا وجود ثابت ہوجائے تو پھر کسی حد تک اس فرقہ کا وجود بھی ثابت ہوجائے گا اگر اس کا وجود ثابت نہ ہوجائے تو یقیناً اس سے منسوب ساری کہانی افسانہ اور جعلی قرار پائے گی۔

عبداللہ بن سبا کو نقل کرنے والے تمام مورخین اس کی سند کو صرف ایک راوی ''سیف ابن عمر'' سے نقل کرتے ہیں اور یقیناً فرقہ سبائیہ کو روایت کرنے والے راویوں میں صرف اسی کا نام آتا ہے۔ سیف بن عمر نے ۱۱ھ سے ۳۰ھ کے واقعات اور حوادث کو اپنی کتب میں نقل کیا ہے۔ ''ابن سبا کی کہانی کو روایت کرنے والوں میں صرف ایک ہی راوی سیف بن عمر ہے، جس کا انتقال ۱۷۰ھ میں ہوا ہے۔'' (۴)

سیف بن عمر کے انتقال کے ایک صدی سے زیادہ گذرنے کے بعد اس سے منسوب روایت کو سب سے پہلے مشہور مورخ طبری نے نقل کیا ہے جبکہ اس کے برعکس سیف کو اس کے اپنے زمانے کے کسی مورخ یا راوی نے نقل نہیں کیا اور نہ راوی سے طبری تک کے درمیانی دور (جو قریبا ۱۴۰ سال تک بنتا ہے) میں اس روایت کو کسی مورخ نے ضبط تحریر میں لایا، خود طبری کے دور میں طبری کے علاوہ کسی دوسرے مورخ نے نقل نہیں کیا، طبری کے بعد بھی تقریبا تین سو سال تک اس قصے کو پھر کسی راوی اور مورخ نے نقل نہیں کیا اس کے بعد مشہور مورخ ابن عساکر نے سیف بن عمر کی روایت کو نقل کیا۔ یوں یہ قصہ کبھی راویوں اور مورخین کے پیش نظر رہا تو کبھی ان کی نظروں سے غائب رہا۔ جس کی وجہ سے یہ قصہ ایک متنازع شکل اختیار کر گیا اور اس کے بارے میں مختلف سوالات پیدا ہوئے کہ:

اس روایت کا صرف ایک ہی راوی کیوں ہے؟

سیف کا مقام راویوں میں کیا ہے؟

حضرت عثمان بن عفان سے سیف تک تقریبا ڈیڈھ سو سال سے زیادہ کا فاصلہ بنتا ہے اگر اتنا بڑا واقعہ ہوا ہے تو خلیفہ راشد حضرت عثمان بن عفان سے سیف کے دور تک کسی اور راوی نے اس کو نقل کیوں نہیں کیا؟ سیف کے ڈیڈھ سو سال بعد اس قصہ کا ماخذ کہاں سے ملا اور یہ ماخذ کتنے قابل اعتبار ہیں؟

راوی سے بھی طبری تک کا زمانہ ۱۴۰ سال کا بنتا ہے اس دوران کسی مورخ نے اس روایت کو اپنی کتاب کا حصّہ کیوں نہیں بنایا؟

خود طبری کے دور میں کسی دوسرے مورخ نے اس کو کیوں نقل نہیں کیا؟

راوی نے اپنی روایت میں عبداللہ بن سبا کے عقائد کے بارے میں تفصیلات بیان نہیں کیا تھا طبری نے اس تفصیل کو کہاں سے درج کیا اور اس کی سند کیا ہے؟

دوسری بات جو طبری کو اس کے راوی سیف سے الگ کر دیتی ہے وہ اس کا یہ خیال کہ ابن سوداء (سبا کو سوداء بھی لکھا گیا ہے) اور اس کے ساتھیوں نے حضرت علی بن ابی طالب میں الوہیت تسلیم کر لی تھی جس کی وجہ سے حضرت علیؑ نے ان کو آگ میں جلا دیا تھا۔ یاد رہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے دور خلافت میں بعض لوگوں کو مرتد

ہونے کی سزا میں آگ میں جلانے کا واقعہ ملتا ہے، یہ بھی تاریخ کا غلط العام واقعہ ہے۔ طٰہٰ حسین نے لکھا ہے کہ حضرت علیؑ نے اپنی مختصر سی خلافت کے دوران کسی کو آگ میں نہیں جلایا تھا البتہ کوفہ میں کچھ لوگ مرتد ہو گئے تھے انہیں قتل کر دیا تھا، جلانے کا واقعہ حضرت علی بن ابی طالب کی خلافت کے دوران پیش ہی نہیں آیا تھا۔ علاوہ ازیں ابتدائی دور کے مورخین نے عبداللہ بن سبا کا قصہ ہی درج نہیں کیا ہے بعد کے اکثر مورخین نے طبری سے اس قصہ کو تاریخ کا حصہ قرار دیا ہے۔ یوں ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس قصہ کا ایک ہی بنیادی ماخذ طبری ہے، طبری کے بعد تاریخ کے دیگر تمام بنیادی اور غیر بنیادی ماخذ میں یہ قصہ آیا ہے۔ جیسے کہ طٰہٰ حسین رقم طراز ہیں۔ ''طبری اپنے راویوں سے اور بعد کے مؤرخین نے خود طبری سے بن سبا کا اور اس کے ساتھیوں کا تذکرہ عہد عثمانؓ میں اور حضرت علی بن ابی طالب کی خلافت کے پہلے سال کے فتنے کے سلسلے میں ذکر کرتے ہیں۔'' (۵)

مورخین اس شخص (عبداللہ بن سبا) کی اسلام مخالف سازشوں میں سے ایک یہ تحریر کرتے ہیں کہ حضرت علیؑ کی خلافت کے پہلے سال اسی شخص کی سازش کی وجہ سے جنگ جمل ہوئی تھی اگر یہ حقیقت ہے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایک سال بعد یہ شخص معرکہ صفین میں کہاں چلا جاتا ہے؟ معرکہ صفین میں اس کا کوئی ذکر نہ شیعیان علیؑ اور نہ ہی خوارج میں ملتا ہے اگر یہ شخص تھا تو پھر معرکہ صفین سے کس طرح غائب رہا؟ اس سلسلے میں مورخین خاموش ہیں۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ اگر ایسا کوئی شخص تھا تو حضرت عثمان بن عفان اور اس کے ساتھی کیوں خاموش رہے؟ تاریخ میں نہیں ملتا ہے کہ حضرت عثمان نے عبداللہ بن سبا کے خلاف کوئی اقدام کیا ہو۔ ایک یہودی خلیفۃ المسلمین کے دور خلافت میں اسلام کے حصّے بخرے کر رہا ہو، خلیفہ اس یہودی سازشی شخص کو جانتا بھی ہو پھر بھی اس شخص کے خلاف کوئی اقدام نہیں کرتا !! ۔ ڈاکٹر طٰہٰ حسین [حضرت عثمانؓ تاریخ اور سیاست کی روشنی میں] تحریر کرتے ہیں۔ ''صدر اسلام کے مسلمانوں کا درجہ ہماری نگاہوں میں اس سے اونچا ہونا چاہیے کہ صنعا سے آنے والا ایک آدمی جس کا باپ یہودی اور ماں حبشن تھی جو خود بھی یہودی تھا پھر خوف یا اخلاص کی بنا پر نہیں بلکہ دھوکہ دینے اور مکر پھیلانے کی غرض سے اسلام لایا۔ اس کی یہ مجال ہو کہ وہ ان کے دین ان کی سیاست ان کی عقل اور ان کی حکومت کے ساتھ مذاق کرے۔ (لہذا) ابتداء کے مورخین نے ابن سبا کے تذکرے سے جو پہلو تہی کی ہے، یہ اس بات کی

غمازی کرتا ہے کہ ''یہ افسانہ تصنّع اور من گھڑت ہے۔اور یہ افسانہ آخری دنوں میں جب شیعہ اور دوسرے اسلامی فرقوں میں معرکہ آرائی ہوئی تراشا گیا ہے۔'' (۶)

لگتا یوں ہے کہ سیف بن عمر نے جان بوجھ کر عبداللہ بن سبا کی روایت کو گھڑا ہے کیونکہ اس میں شک کی گنجائش نہیں ہے کہ بنی ہاشم کی عداوت اور بنی امّیہ کی مداحی میں یہ شخص اپنے زمانے میں مشہور تھا۔سیف بن عمر نے بنی ہاشم کی عداوت میں بہت سارے اقدامات کئے تھے۔ یہ وہی شخص تھا جو خود ساختہ، جعلی اور وضعی ناموں سے روایات نقل کرتا تھا اور ان جعلی ناموں کو اصحاب رسول ہونے کا درجہ دیتا تھا تا کہ جعلی اور وضعی باتوں کو حدیث کا درجہ دے سکے اور جعلی سلسلہ روایت کو قائم کر سکے، نیز اس نے علی بن ابی طالب کی عداوت میں دو کتابیں بھی تحریر کی تھی۔

''انّ رجلاً یسمّی سیف بن عمر التمیمی مات فی القرن الثانی الهجری، وضع کتابین: الاول (الفتوح والردة)) والثانی(الجمل و مسیر عائشة و علی)و حشاهما.(۱) اختلاق الحوادث التی لا حقیقیة لها و لا اساس.(۲) تحریف الحوادث الثابتة، و تزییفها یجعل الایجاب سلباً والسلب ایجاباً.فلقد اختَلَقَ سیف لرسول الله صلی الله علیه و آله و سلم اصحاباً لا وجود لهم، اسمائهم باسماء لم یسمع بها الرسول و لا احد من اصحابه، مثل سعیر، الهزهاز، واُطّ، و حمیضة، و ما ذلک، کما ابتدع رجالاً من التابعین و غیر التابعین، ووضع علی لسانهم الاخبار ولاحادیث.

بے شک وہ آدمی جن کا نام سیف ابن عمر ہے، دوسری صدی ہجری میں فوت ہوا ہے۔اس نے دو کتابیں ''الفتوح والردہ'' اور ''الجمل ومسیر عائشہ وعلی'' لکھی تھی۔جس کا مقصد صرف یہ ہے۔کہ ایسی حوادث تخلیق کرنا جن کی نہ تو کوئی حقیقت ہے اور نہ ہی بنیاد۔۲۔تاریخ کے ثابت شدہ یقینی حادثات اور واقعات میں تحریف پیدا کرنا، اور اس میں ردو بدل کر کے ثابت شدہ کو معدوم کرنا اور معدوم کو ثابت کرنا ہے۔سیف بن عمر نے ایسی اصحاب رسول کے نام بھی وضع

کئے ہیں، جن کا حقیقت میں کوئی وجود نہیں رہا ہے۔ان کے ایسے نام وضع کئے ہیں جن کو رسول اکرم ﷺ اور آپؐ کے اصحاب سے نہیں سنا گیا ہے۔ جیسے سعیر، ھزھاز، اطّ، حمضہ، لیکن ان ناموں سے تابعین اور تبع تابعین میں بھی کوئی نہیں گزرا ہے اور نہ ہی احادیث میں یہ نام آئے ہیں۔(۷)

لہٰذا ایک ایسا شخص جو جھوٹا اور جعلی احادیث بنانے میں شہرت رکھتا ہو۔اس کی روایت کس طرح قابل اعتماد ہوسکتی ہے؟ سیف بن عمر کے جھوٹے ہونے کے بارے میں بہت ساروں نے لکھا ہے۔ علامہ مرتضیٰ عسکری نے ان تمام محدثین، متکلمین اور مورخین کے سیف بن عمر کے بارے میں تاثرات کو مستند حوالوں سے نقل کیا ہے۔ ان میں سے بعض محدثین طبری سے بھی پہلی یا چوتھی صدی ہجری کے دور کے ہیں۔جن میں امام نسائی (متوفی ۳۰۳ ھ)، ابوداود (متوفی ۲۷۵ ھ)، یحیی بن معین (متوفی ۲۳۳ ھ)، ابن حمّاد عقیلی (متوفی ۳۲۲ ھ)، ابن ابی حاتم (متوفی ۳۲۷ ھ) ابن سکن (متوفی ۳۵۳ ھ) ابن حبان (متوفی ۳۵۴ ھ)، دارقطنی (متوفی ۳۸۵ ھ) ابن عدی (متوفی ۳۴۸ ھ)، حاکم (متوفی ۴۰۵ ھ)، محمد بن احمد ذہبی (متوفی ۷۴۸ ھ)، ابن حجر (۸۵۲ ھ)، سیوطی (متوفی ۹۱۱ ھ) وغیرہ۔ان محدثین میں سے امام نسائی سیف بن عمر کے بارے میں کہتا ہے: ''ضعیف ہے اس کی حدیث کو (نقل کرنے) سے ترک کیا ہے، وہ نہ قابل اعتماد ہے اور نہ ہی امین ہے''۔ یحیی بن معین کہتا ہے۔''اس کی (سیف بن عمر) حدیث کمزور اور سست ہے''۔ابوداود رقم طراز ہیں۔''بہت ہی جھوٹا ہے''۔(۸)

رہی بات مورخین کی تو انہوں نے اس روایت کو کیوں اور کہاں سے درج کیا ہے؟ جیسا کہ بتایا جاچکا کہ تاریخ نویسیوں میں سے سب سے پہلے ابوجعفر محمد جریر طبری (متوفی ۳۱۰ ھ) نے اپنی کتاب ''تاریخ الامم و الملوک'' میں سیف بن عمر کی روایت کو نقل کیا ہے۔ وہ خلیفۃ المسلمین حضرت عثمان کے دور خلافت سے متعلق اس فرقہ کے بارے میں تقریباً ڈیڑھ سو سال بعد ایک ہی راوی سیف بن عمر سے نقل کرتا ہے۔ یہ بالکل بدیہی بات ہے کہ اگر اتنا بڑا کوئی واقعہ ہوتا تو یقیناً اس کو متعدد راوی نقل کرتے تھے۔سیف کے ڈیڑھ سو سال بعد سب سے طبری (متوفی ۳۱۰ ھ) نے سیف کی اس روایت کو درج کیا ہے۔جس عرصے میں سیف نے اس روایت کو نقل کیا ہے اسی عرصے میں کوئی دوسرا راوی اس کو نقل کرتا نظر نہیں آتا اسی طرح جس دوران طبری نے اپنی کتاب میں اس روایت کو

درج کیا ہے اسی دوران کوئی دوسرا مورخ اس کو درج کرتا نظر نہیں آتا ہے۔ طبری کے ڈھائی سو سال بعد ابن عساکر (متوفی ۵۷۱ھ) نے اس روایت کو سیف بن عمر کی کتب سے نقل کیا ہے۔ ابن عساکر کے بعد مورخین پھر خاموش نظر آتے ہیں۔ ایک لمبے عرصے کے بعد ساتویں صدی ہجری میں ابن اثیر (متوفی ۶۳۰ھ) نے، پھر آٹھوی صدی ہجری میں محمد بن یحیٰ بن محمد اشعری (متوفی ۷۴۱ھ) اپنی کتاب ''التمهيد والبيان في مقتل عثمان بن عفان'' میں سیف بن عمر کی کتاب ''الفتوح'' سے نقل کرتے ہیں۔(۹)

سیف بن عمر کی وفات کو سو سال سے زیادہ کے عرصہ گذرنے کے بعد سیف کی مذکورہ دونوں کتابوں سے طبری نے اس روایت کو نقل کیا پھر طبری سے دیگر مورخین نے بالواسطہ یا بلا واسطہ اس روایت کو اپنی کتاب کا حصہ بنایا۔ بعد میں ابن اثیر نے ۶۳۰ھ، ابن عساکر نے ۵۷۱ھ، ابن ابی بکر نے ۷۴۱ھ اور ذہبی نے ۷۴۸ھ میں اس روایت کو سیف کی کتب سے طبری کے حوالے سے نقل کیا ہے۔ یوں ہم کہہ سکتے ہیں کہ چار قدیم مورخین نے اس روایت کو نقل کیا، پھر ان چار مورخین سے اس کہانی کو دیگر مورخین نے نقل کیا ہے۔ ان چار مورخین کا اصل اور بنیادی مصدر سیف بن عمر کی کتب ''کتاب الفتوح'' اور ''کتاب الجمل'' ہیں۔ بعد کے تمام مورخین کے مصادر یہی چار مورخین ٹھہرتے ہیں۔ لہذا اگر کسی روایت کا راوی ایک ہو یا سلسلہ روایت منقطع ہو تو وہ روایت حدیث کی اصطلاح میں مرسل اور ضعیف قرار پاتی ہے، اسی طرح علم رجال کے مطابق اگر کوئی راوی جھوٹا اور دروغ گو ہو تو اس کی روایت ضعیف کہلاتی ہے، سیف بن عمر کے دروغ گو ہونے میں کوئی شک وشبہہ بھی نہیں ہے تو پھر کس طرح اس کی روایت صحیح ہوسکتی ہے؟

خلاصہ کلام یہ ہے کہ عبداللہ بن سبا کے اصل مصادر کی صحیح تجزیہ سے یہ بات عیاں ہوجاتی ہے کہ اس کا وجود خود ساختہ اور جعلی ہے۔ جس کو بنی ہاشم کی عداوت میں گھاڑا گیا ہے یا خلیفہ المسلمین حضرت عثمان کی شان خلافت کو کمزور ظاہر کرنے کے لئے گھاڑا گیا ہے کیونکہ یہ ایک بدیہی بات ہے کہ حضرت عثمان بن عفان کے دور خلافت میں یمن کے رہنے والے ایک یہودی نے اسلام کا لبادہ اوڑ کر اتنی بڑی تحریک چلائی ہو جس کے نتیجے میں خلیفۃ المسلمین کا قتل ہوا ہو۔ ایسے کیسے ممکن ہے کہ حضرت عثمان کو اس تحریک کا پتہ نہ چلا ہو اور اگر علم ہوا تو پھر اس کے

خلاف کوئی اقدام نہ کیا ہو؟

مذہب تشیع اس فرقہ کے وجود سے ایک طرف انکار کرتے ہوئے نظر آتا ہے جس کی مثال علامہ مرتضی عسکری کی کتاب یا دیگر شیعہ مورخین کی کتب ہیں جن میں اس فرقہ کو افسانہ اور من گھڑت قرار دیا گیا ہے، اس کو دین اسلام بالخصوص مذہب تشیع کے خلاف ایک سازش قرار دیا ہے لیکن دوسری طرف بعض شیعہ علماء رجال نے اس کہانی کو اپنی رجال کی کتب کا حصہ بھی بنایا ہے۔

اکثر علمائے رجال کے نزدیک نزاع یہ نہیں ہے کہ عبداللہ بن سبا نامی کوئی شخص تاریخ میں گذرا ہے یا نہیں، بلکہ اس کے نظریات کی بناء پر اسے غالی اور مرتد قرار دیا ہے۔ شیعیت کی اکثر رجال کی کتابوں میں عبداللہ بن سبا کا ذکر بحوالہ رجال کشی ملتا ہے۔ شیخ کشی کی اصل کتاب نایاب ہے، لیکن اس سے منسوب حوالے اکثر شیعہ ماہرین علم رجال اپنی کتابوں میں دیتے ہیں۔ شیخ طوسی نے رجال کشی سے منسوب کر کے رجال کی [تعلیقۃ اختیار فی معرفۃ رجال] نامی ایک کتاب لکھی ہے، جو خود رجال کشی سے معروف ہوئی ہے، رجال کی کتابوں کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ شیخ کشی نے عبداللہ بن سبا کے وجود سے تو انکار نہیں کیا ہے۔ بلکہ ان کا نظریہ ہے۔

''و کان اول من شهر بالقول بفرض امامة علی و اظهر البرائة من اعدائه و کاشف مخالفیه و کفرهم، فمن ها هنا قال من خالف الشیعه: التشیع و الرفض ماخوذ من الیهودیة''

یہ پہلا مشہور شخص تھا جس نے علی بن ابی طالب کی امامت کو فرض سمجھتے ہوئے علیؑ کے دشمنوں سے بیزاری کا اعلان کیا اور ان کے مخالفین کو کافر قرار دیا۔ پس یہی سے شیعہ مخالفین نے کہا: اصل تشیع اور رفض یہودیت سے ماخوذ ہے۔''(۱۰)

اسی عبارت کو دور حاضر کے مشہور شیعہ عالم دین آیت اللہ الخوئی نے بھی اپنی رجال کی کتاب ''رجال الخوئی'' میں بعینیہ رقم کیا ہے۔ علماء رجال نے جہاں ایک طرف عبداللہ بن سبا کو نقل کیا ہے وہیں پر اسے فرضی وہمی اور افسانوی قرار دیتے ہوئے متفقہ طور پر اس پر لعنت کی ہے اور اسے غالی، مرتد اور کافر قرار دیا ہے۔

''عبدالله بن سباء الذی رجع الیٰ الکفر و اظهر الغلو. عبدالله بن سباء

.....غال ملعون لعنه الله۔

عبداللہ بن سباوہ ہے، جس نے کفر کیا ہے اور اس کا غلو ظاہر ہوا ہے۔ عبداللہ بن سبا غالی ۔۔۔ اور ملعون ہے، اللہ تعالیٰ کی اس پر لعنت کی ہے۔'' (۱۱)

شیخ کشی، شیخ طائفۃ، علامہ مجلسی اور آیۃ اللہ الخوئی نے اپنی رجال کی کتب میں فرقہ سبائیہ کی حیثیت پر بحث نہیں کیا ہے بلکہ اس کے بانی کے نظریات اور افکار کو مورد بحث بنایا ہے اور ان نظریات کی بنا پر اس شخص کو لعنتی اور کافر قرار دیا ہے۔ علمائے رجال نے عبداللہ ابن سبا پر لعنت بھیجنے کے علاوہ یہ بھی تحریر کیا ہے کہ اسی ملعون شخص کے غالی نظریات کو بنیاد بنا کر دنیا شیعیت کو اس سے منسوب کیا جاتا ہے، جو عقلی، نقلی اور تاریخی طور پر صحیح نہیں ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ عبداللہ بن سبا تاریخ کی ایک فرضی شخصیت گزری ہے جس کو ایک ہی راوی سیف بن عمر نے روایت کیا اور اس روایت کو سب سے پہلے مشہور مورخ طبری نے نقل کیا جس کے بعد بن سباء کی شخصیت تاریخ کا حصہ بنی ہے۔ اگر ابن سباء کے وجود کو تسلیم بھی کیا جائے تو اس کو مذہب تشیع سے منسلک کرنا صحیح نہیں ہے کیونکہ اس سے منسوب عقائد غیر اسلامی ہیں جس کا مذہب تشیع سے کوئی تعلق نہیں بنتا ہے۔ بغدادی نے اس شخص سے منسوب فرقہ کو اہل غلاۃ میں سے قرار دیتے ہوئے اس کو کافر قرار دیا ہے اسی طرح علم الرجال کے ماہرین شیعہ علماء نے بھی اس شخص کو غالی اور کافر قرار دیا ہے۔

نتیجہ

تاریخ اسلام میں ''عبداللہ بن سبا'' نامی شخص سے منسوب ایک فرقہ مشہور ہے دسے سبائیہ کہا جاتا ہے۔

فرقہ سبائیہ کا خلاصہ یہ ہے کہ خلیفہ سوم عثمان کے زمانے میں ایک یہودی شخص عبداللہ ابن سبا نے اسلام کا اظہار اور مسلمانوں کو علی ابن ابی طالب کرم اللہ وجہ کی بیعت کرنے کی دعوت دی اور علی بن ابی طالب علیہ السلام کی خلافت کو پھیلانے کی کوشش کی اور بہت سارے مسلمان اس کی پیروی میں آ گئے جن کا نام شیعان علیؑ پڑ گیا۔

قدیم اور جدید بعض محققین نے اس قصہ کے وجود کو شک کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ مشہور مورخ اور عالم ڈاکٹر طٰحسین مصری اس قصہ کو حضرت عثمان کے خلاف سازش قرار دیتے ہیں۔

اس قصہ کے جعلی اور خود ساختہ ہونے کی بہت ساری وجوہات ہیں۔ جن میں سے چند مندرجہ ذیل ہیں۔

۱)۔اس قصے کا ایک ہی راوی سیف بن عمر ہے۔

۲)۔سیف بن عمر کا مقام رایوں کے نزدیک نہایت متنازع ہے اور وہ بنی ہاشم سے عداوت میں مشہور گزرا ہے۔

۳)۔عثمان بن عفان سے سیف تک تقریباً ڈیڑھ سو سال سے زیادہ کا عرصہ بنتا ہے اس دوران کسی راوی نے اس کو نقل نہیں کیا۔

۴)۔سیف کے انتقال کے ۱۴۰ سال بعد مشہور مورخ طبری نے اس سے نقل کیا ہے۔اس دوران طبری کے علاوہ کسی اور مورخ نے اس سے کوئی روایت نقل نہیں کی ہے۔

۵)۔طبری کے بعد تقریباً تین سو سال تک اس قصے کو پھر کسی راوی اور مورخ نے بھی نقل نہیں کیا۔

جناب عثمان بن عفان کے دور خلافت میں یمن کے رہنے والے ایک یہودی نے اسلام کا لبادہ اوڑھ کر اتنی بڑی تحریک چلائی جس کے نتیجہ میں خلیفہ کا قتل ہوا۔یہ کیسے ممکن ہے کہ عثمان کو اس تحریک کا پتہ نہ چلا ہو اور اگر علم ہوا ہے تو پھر اس کے خلاف کوئی اقدام کیوں نہ کیا؟

مذہب تشیع اس قصہ کے وجود سے انکار کرتا ہے۔اور اس کو بنی ہاشم سے عداوت کا نتیجہ قرار دیتا ہے۔

بعض شیعہ علمائے رجال اپنی رجال کی کتب میں فرقہ سبائیہ کی حیثیت پر بحث نہیں کی ہے بلکہ اس کے بانی کے نظریات کی بنا پر اس شخص کو لعنتی اور کافر قرار دیتے ہوئے اس قصہ نقل کیا ہے۔

غیر متعصّبانہ تحقیقات سے واضح ہو جاتا ہے کہ عبداللہ بن سبا ایک افسانوی شخصیت کے علاوہ اور کوئی حیثیت رکھتا ہے۔شیعیت کو اس افسانوی شخص سے منسوب کرنا عقلی،نقلی اور تاریخی طور پر صحیح نہیں ہے۔

حوالہ جات

(۱) بغدادی،عبد القاهر بن طاهر، الفَرقُ بن الفِرَق، ص/ ۲۱۵،دار المعرفة بيروت، لبنان 2003ء

(۲) طٰہٰ، ڈاکٹر حسین، حضرت عثمان تاریخ اور سیاست کی روشنی میں، صفحہ ۱۴۴، مترجم علامہ عبدالحمید نعمانی، نفیس اکیڈمی اردو بازار کراچی، طبع ششم فروری ۱۹۸۹ء

(۳) طٰہٰ، ڈاکٹر حسین، حضرت علی تاریخ اور سیاست کی روشنی میں، صفحہ ۱۰۲، مترجم علامہ عبدالحمید نعمانی، نفیس اکیڈمی اردو بازار کراچی، طبع ششم فروری ۱۹۸۹ء

(۴) عبداللہ بن سبا، جلد اول، ص ۳۶،

(۵) حضرت علی تاریخ اور سیاست کی روشنی میں، صفحہ ۱۰۴

(۶) حضرت عثمانؓ تاریخ اور سیاست کی روشنی میں، صفحہ ۱۰۰ و ۱۴۴،

(۷) عبداللہ بن سبا، جلد اول، ص ۱۲

(۸) عبداللہ بن سبا، جلد اول، ص ۹۸، ۹۹، ۱۰۰، جلد ۱، مترجم سید قلبی حسین رضوی، سال طبع صفر ۱۴۲۷ھ، مجمع جہانی اہل بیت، قم

(۹) عبداللہ بن سبا، ص ۹۲، جلد ۱،

(۱۰) طوسی، شیخ الطائفہ ابی جعفر، تعلیقۃ اختیار معرفۃ الرجال، ج ۲، ص ۳۲۴، نشر موسسہ آل البیت قم تاریخ الطبع ۴۰۴۔

(۱۱) **تعلیقه اختیار معرفة الرجال**، ج ۲ ص ۳۲۴

اقبال کی نظر میں مسلمانوں کے مسائل اور ان کا حل

(آخری قسط)

سید معراج مہدی رضوی

جذبہ ایثار و شہادت کا فقدان :

یہی وہ جذبات تھے، یہی وہ سرمایہ تھا جس کے زور سے مسلمان فلک نشین اور گردوں جناب بنا لیکن جیسے جیسے یہ جذبات حیات بخش اس کی فطرت سے دور ہوتے گئے اس میں زوال و پس ماندگی کا دور بڑھتا گیا۔ اقبال اس حقیقت کی عکاسی میں فرماتے ہیں:

تیغ و تفنگ دستِ مسلماں میں ہے کہاں ہو بھی تو دل ہیں موت کی لذت سے بے خبر
کافر کی موت سے بھی لرزتا ہے جس کا دل کہتا ہے کون اس سے مسلماں کی موت مر
تعلیم اس کو چاہیے ترکِ جہاد کی دنیا کو جس کے پنجہ خونیں سے ہو خطر
ہم پوچھتے ہیں شیخِ کلیسا نواز سے مشرق میں جنگ شر ہے تو مغرب میں بھی ہے شر
حق سے اگر غرض ہے تو زیبا ہے کیا یہ بات اسلام کا محاسبہ یورپ سے درگزر

ضرب کلیم ۵۴۱

زمانہ میں بدلاؤ آیا مجاہدانہ فکر وحرارت گئی خانقاہی نظام قائم ہوا اور مسلمانوں کی قدرت واقتدار کا دائرہ محدود ہوتا چلا گیا لیکن غافلگیر مسلمان اذان بیداری کی جگہ توجیہ عمل کرتا نظر آیا

مجاہدانہ حرارت رہی نہ صوفی میں بہانہ بے عملی کا بنی شراب الست

ضرب کلیم ۵۵۱

لیکن جہاں تخیل میں پرواز، دل میں حرارت تھی اس نے اپنی زندہ دلی کا ثبوت دیا اور وہ بارگاہ خداوندی میں دعا گو نظر آیا:

دلوں کو مرکزِ مہر و وفا کر حریم کبریا سے آشنا کر
جسے نان جویں بخشی ہے تو نے اسے بازوئے حیدرؓ بھی عطا کر

بال جبرئیل ۳۴۹

اگر حوصلہ بلند ہو راہ آسان اور منزل نزدیک ہوتی ہے دریا میں راستے، پہاڑ میں در بنتے ہیں یہی شان بندگان ربانی کی رہی ہے

جرأت ہو نمو کی تو فضا تنگ نہیں ہے اے مردِ خدا ملکِ خدا تنگ نہیں ہے

ضرب کلیم ۵۶۶

افکار میں محدودیت اور ظاہر نگری:

مسلمانوں کی تعلیم سے دوری اور اسلام واقعی سے ناآشنائی اور وابستگی اسکے افکار کو سطحی اور محدود کرتی چلی گئی، عمیق الفکر، دقیق النظر کا خطاب رکھنے والا مسلمان ظاہر نگری، کوتاہ فکری کا شکار بن گیا نتیجہ میں وقت کی ظاہری چمک دمک نے اس کو اپنا گرویدہ بنالیا۔ عالمی فکر وخیال رکھنے والا مسلمان سے علاقیت اور قومیت کی بو آرہی ہے، کرہ ارض کو اپنا وطن جاننے والا مسلمان کی فکر ملک کی سرحدوں قید نظر آرہی ہیا نسانیت کو اپنی قوم بتانے والے مسلمان میں ذات پات، رنگ روپ، زبان وتمدن میں امتیاز نظر آرہا ہے ان تمام محدودیت کا راز، فکر وخیال میں تنگی کا سبب اسکا

تعلیم سے دور ہونا اور اسلام واقعی کے اہداف ومقاصد سے مکمل آشنائی کا نا ہونا ہے کہ جس حقیقت کو اقبال اس انداز میں بیان کرتے ہیں۔

نظر آتے نہیں بے پردہ حقائق ان کو　　آنکھ جن کی ہوئی محکومی و تقلید سے کور
زندہ کرسکتی ہے ایران وعرب کو کیوں کر　　یہ فرنگی مدنیت کہ جو ہے خود لب گور

ضرب کلیم ۵۸۴

سرزمین ہندوستان میں اپنے علم وکردار، تدبیر وکاوشوں کا پرچم لہرانے والے مسلمان اپنی ہی سرزمین پر ،اپنے ہی ہاتھوں اپنا شیرازہ وجود مٹا بیٹھے جسکا اثر دور حاضر میں مسلمانوں کی پسماندگی کی صورت ظاہر ہوا کہ جس کی عکاسی اوبال اس انداز میں کرتے نظر آتے ہیں۔

ہند میں حکمت دیں کوئی کہاں سے سیکھے　　نہ کہیں لذت کردار، نہ افکار عمیق
حلقہ شوق میں وہ جرات اندیشہ کہاں　　آہ محکومی وتقلیدو زوال تحقیق
خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں　　ہوئے کس درجہ فقیہان حرم بے توفیق
ان غلاموں کا یہ مسلک کہ ناقص ہے کتاب　　کہ سکھاتی نہیں مومن کو غلامی کے طریق

ضرب کلیم ۵۳۴

اقبال مسلمانوں کی فکری محدودیت کی عکاسی کرتے ہوئے ان کو بیداری کا پیغام یوں دیتے نظر آتے ہیں:

تو ابھی رہ گزر میں ہے قید مقام سے گزر　　مصر وحجاز سے گزر، پارس شام سے گزر
جس کا عمل ہے بے غرض اس کی جزا کچھ اور ہے　　حور وخیام سے گزر بادہ جام سے گزر
گرچہ ہے دلکشا بہت حسن فرنگ کی بہار　　طائرکِ بلند بال، دانہ و دام سے گزر
تیرا امام بے حضور، تیری نماز بے سرور　　ایسی نماز سے گزر ایسے امام سے گزر

بال جبرئیل ۳۶۷

یہ محدودیت نہ صرف عوام الناس کے درمیان حکمران رہیں بلکہ علما اور صوفیوں کے خاص طبقہ بھی دیکھیں گھیں جسکی

توصیف اقبال اس انداز میں کرتے نظر آتے ہیں۔

ملا کی نظر نور فراست سے خالی　　بے سوز ہے میخانہ صوفی کی مئے ناب
بیدار ہوں دل جس کی فغان سحری سے　　اس قوم میں مدت سے وہ درویش ہے نایاب

ارمغان حجاز ۳۸۷

اقبال ملت اسلام کو ماضی کا آئینہ دکھاتے ہوئے خوابیدہ فکر کو اس طرح جگاتے نظر آتے ہیں:

پوچھ اس سے کہ مقبول ہے فطرت کی گواہی　　تو صاحب منزل ہے کہ بھٹ کا ہوا راہی
کافر ہے مسلماں تو نہ شاہی نہ فقیری　　مومن ہے تو کرتا ہے فقیری میں بھی شاہی
کافر ہے تو شمشیر پہ کرتا ہے بھروسہ　　مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی
کافر ہے تو ہے تابع تقدیر مسلماں　　مومن ہے تو وہ آپ ہے تقدیر الٰہی
میں نے تو کیا پردہ اسرار کو بھی چاک　　دیرینہ ہے تیرا مرض کور نگاہی

بال جبرئیل ۳۷۰

اتحاد کا فقدان:

مسلمانوں کی تعداد اور قدرت لوگوں کے لئے ہمیشہ توجہ کا مرکز رہی ہے۔لیکن افسوس وہ طاقت وہ تعداد اختلاف وانتشار کی وجہ سے بے سود وثمر رہی نتیجہ میں مسلمان تمام عظمت وابوہت کے باوجود روز بروز پستی وزوال کے روبرو تھا ہمارے اس اختلافات میں جہاں ہماری نادانی،فکری محدودیت وغیرہ شامل تھی وہیں مقابل کی سازش وپالسی بھی شامل تھی لیکن ہم اس قدر غافل گیر تھے کہ اس راز کو سمجھنے کی ضرورت محسوس نہ کی نتیجہ میں مقابل روز بروز قوی تر اور ہم کمزور وناتواں ہوتے چلے گئے لھذا اقبال کا کافی زور مسلمانوں کے درمیان اتحاد ویکجہتی پر رہا وہ مسلمانوں کے زوال کا حل وحدت وانسجام کے آینہ میں تلاشتے تھے

ہے زندہ فقط وحدتِ افکار سے ملت　　وحدت ہو فنا جس سے وہ الہام بھی الحاد
وحدت کی حفاظت نہیں بے قوتِ بازو　　آتی نہیں کچھ کام یہاں عقلِ خدا داد

ضرب کلیم ۵۴۸

قوم میں اتحاد و اختلاف کا سرچشمہ ہمیشہ رہبران اور علماء اکرام رہے ہیں لھذا اگر کسی قوم میں اتحاد کی حکمرانی ہے تو یہ علماء و رہبران کی کاوشوں کا نتیجہ ہے اسی طرح اگر ملت میں اختلاف کی حکمرانی ہے تو علماء و رہبران کی ہوس رانی کا ثمر ہے اقبال جس دور سے گزر رہے تھے اس دور میں اختلاف بین العلماء ایک عام چیز بن چکی تھی جس کا خمیازہ پوری قوم کو بھرنا پڑا۔

نہ میں اعجمی نہ ہندی نہ عراقی و حجازی — کہ خودی سے میں نے سیکھی دو جہاں میں پایداری
تو مری نظر میں کافر میں تری نظر میں کافر — ترا دیں نفس شماری مرا دیں نفس گذاری

ضرب کلیم ۵۸۷

ہماری غفلت کا یہ عالم ہے کہ ہم جس مقام و منصب کی لڑائی لڑ رہے ہیں جس جائداد پر جھگڑ رہے ہیں وہ باقی ہی نہ رہی اور ہمیں احساس بھی نہ ہوا ہمارا جھگڑا آج بھی باقی و جاری ہے۔

ہاتھوں سے اپنے دامن دنیا نکل گیا — رخصت ہوا دلوں سے خیالِ معاد بھی
قانون وقف کے لئے لڑتے تھے شیخ جی — پوچھو تو وقف کے لئے ہے جائداد بھی

بانگ درا ۳۱۸

اقبال کبھی اس انداز میں بیان کرتے ہیں۔

آہ اس راز سے واقف ہے نہ ملّا نہ فقیہ — وحدت افکار کی بے وحدت کردار ہے خام

ضرب کلیم ۵۳۷

دین و سیاست میں جدائی:

اسلام میں سماج کی ترقی اور فلاح میں رہبر و رہبری کا ایک اساسی نقش سمجھا جاتا ہے اور معارف اسلامی ،سیرۂ نبویؐ میں دین اور سیاست کا کبھی بھی جدا جدا مفہوم نہ تھا بلکہ دین عین سیاست اور سیاست عین دینداری جانی جاتی تھی مسلمانوں کی صدر اسلام میں کامرانی کا ایک اھم راز دین و سیاست کی یک جہتی تھی لیکن مغربی تہذیب و

سیاست نے اسلام کو تباہ کرنے کے لئے دین وسیاست کی جدائی کا نعرہ بلند کیا رفتہ رفتہ یہ مرض مسلم سماج میں بھی راسخ و نافذ ہو گیا بحر حال ان افکار نے عالم اسلام کو تباہی اور بربادی کے اس موڑ پر لا کر کھڑا کر دیا جہاں سے دور دور تک صرف اور صرف نابودی ہی نابودی نظر آتی ہے اقبال کی تیز بین نگاہ نے اس حقیقت کو بخوبی درک کر لیا تھا۔

جلالِ بادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو　　جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

بال جبرئیل ۳۷۴

دین سے سیاست کی جدائی کے بعد سیاست کا جو رویہ ہوتا ہے اس کا نتیجہ آج ہمارے سامنے ہے

سیاست نے مذہب سے پیچھا چھڑا یا　　چلی کچھ نہ پیرِ کلیسا کی پیری

ہوئی دین و دولت میں جس دم جدائی　　ہوس کی امیری ہوس کی وزیری

بال جبرئیل ۴۴۶

رہبری کا فقدان:

مسلمانوں کی شکست وزوال میں ایک اہم سبب یہ بھی رہا کہ اس کو قابل ولائق رہنما نہ ملے مدارس زوال پذیر ہو چکے تھے، فکریں محدود ہو چکی تھیں، خانقاہی نظام دلوں میں مردگی کا احساس پیدا کر رہا تھا، علما اپنے فرائض کی ادائگی میں ناکام تھے، نتیجہ میں دنیا پرستی کے سوداگر مسلمانوں کی رہبری کے نام سے اپنی ہوس کی روٹیاں سیک رہے تھے قوم کے مسائل کو درک کرنے اور ان کو حل کرنے والا کوئی نہ تھا قوم گویا اپنی بے بسی کا ماتم کرتی نظر آرہی تھی

حیراں ہے بوعلی کہ میں آیا کہاں سے ہوں　　رومی یہ سوچتا ہے کہ جاؤں کدھر کو میں

جاتا ہوں تھوڑی دور ہر اک راہرو کے ساتھ　　پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

بال جبرئیل ۴۷۸

اقبال کبھی اس انداز میں بیان کرتے ہیں۔

آہ اس راز سے واقف ہے نہ ملّا نہ فقیہ　　وحدت افکار کی بے وحدت کردار ہے خام

قوم کیا چیز ہے قوموں کی امامت کیا ہے　　اس کو کیا سمجھیں یہ بیچارے دو رکعت کے امام

ضرب کلیم ۵۳۷

دور حاضر میں مسلمانوں جہاں ایک طرف رہبر کا نہ ہونا ہے وہیں دوسری طرف اگر رہبر ملے بھی تو ان میں وہ بنیادی اور اصولی صفات نہ تھے جو ایک رہبر میں ہونے ضروری ہیں جس کی عکاسی اقبال ان لفظوں میں کرتے نظر آتے ہیں۔

عقل بے مایہ امامت کی سزاوار نہیں — راہبر ہو ظن وتخمیں تو زبوں کارِ حیات
فکر بے نور ترا ، جذب عمل بے بنیاد — سخت مشکل ہے کہ روشن ہو شب تار حیات

ضرب کلیم ۵۵۱

جب قیادت کرنے والی صنف ہی فکری محدودیت سے دوچار رہے تو عوام سے کیا گلہ لہذا قوم کی نگاہیں آج بھی بیداری کی شمع جلانے والے کسی مسیح کا انتظار کر رہی ہیں۔

ملا کی نظر نور فراست سے خالی — بے سوز ہے میخانہ صوفی کی مئے ناب
بیدار ہوں دل جس کی فغان سحری سے — اس قوم میں مدت سے وہ درویش ہے نایاب

ارمغان حجاز ۷۳۸

عرب حکمرانوں کی نااھلی:

مسلمانوں کے زوال میں عرب حکمرانوں کی نااہلی بھی ایک اہم نقش رکھتی ہے اس نااہلی کا سلسلہ وفات سرکار کائنات کے بعد مسلمانوں میں ملوکیت کے رواج سے شروع ہو گیا جس کے اثرات رفتہ رفتہ سامنے آتے چلے گئے جن کے ہاتھوں میں قوم کی قیادت تھی آہستہ آہستہ عیش وتجملات کے اسیر ہوتے چلے گئے جسکا بہترین نمونہ مسلم ممالک خصوصاً عرب ممالک کی موجودہ سیاست کی شکل میں دیکھا جاسکتا ہے۔

کرے یہ کافرِ ہندی بھی جرأتِ گفتار — اگر نہ ہو امراءِ عرب کی بے ادبی
یہ نکتہ پہلے سکھایا گیا کس امت کو؟ — وصالِ مصطفوی افتراقِ بو لہبی
نہیں وجود حدود و شعور سے اسکا — محمدؐ عربی سے ہے عالمِ عربی

ضرب کلیم ۵۷۷

عیش و تجملات کا دور دورہ:

سادگی اور قناعت مشرقی اقوام خصوصاً مسلم سماج کی برجستہ پہچان رہی ہے یہ وہ کلید ہے جس کے ذریعہ قوم اور سماج ہزاروں برائیوں سے خود کو بچا سکتی ہے اپنے وجود کو سکون دے سکتی ہے کیونکہ نہ جانے کتنی اخلاقی برائیاں ہیں جو سادگی اور قناعت شعاری کی دوری کے نتیجہ میں سماج میں پیدا ہوئی ہیں آج ہماری مشرقی اقوام خصوصاً مسلم سماج کی بدحالی کا سبب سادگی اور قناعت شعاری سے گریز ہے اور ہم عیش طلبی کے نتیجہ میں اپنے سماج کو ہزاروں برائیوں کا نشیمن بنا بیٹھے ہیں۔

لہذا ہمیں اپنا کھویا ہوا سکون و اطمنان حاصل کرنے کے لئے سادگی اور قناعت شعاری کی تہذیب کو دوبارہ زندہ کرنا ہوگا ورنہ نہیں معلوم آنے والا کل ہمیں تباہی کے کس درجہ پر پہنچا دے۔

تیرے صوفے ہیں افرنگی تیری قالیں ہے ایرانی　　لہو مجھکو رلاتی ہے جوانوں کی تن آسانی
امارت کیا، شکوہ خسروی بھی ہو تو کیا حاصل　　نہ زورِ حیدریؓ تجھ میں نہ استغنائے سلمانی

بال جبرئیل ۴۴۷

قوم کی قناعت و سادگی وہ دولت ہے جو غریبی میں شاہی کا مزہ دیتی ہے دلوں کے سکون کا ذریعہ بنتی ہے

آہ کہ کھو گیا تجھ سے فقیری کا راز　　ورنہ ہے مالِ فقیری سلطنتِ روم و شام

بال جبرئیل ۳۹۱

افسوس تہذیب حاضر کے جھوکے ہماری سادگی اور قناعت کو ہوا کر گئی۔

نہ ڈھونڈ اس چیز کو تہذیبِ حاضر کی تجلی میں　　کہ پایا میں نے استغنا میں معراج مسلمانی

اسلام دنیا کے لئے قناعت و سادگی کا درس لے کر آیا تھا، شہنشاہیت کا خاتمہ کرنے آیا تھا انسانی سماج میں عدل و انساف کے قیام اور غریبوں کی مدد و دل جوئی کا نیا نسخہ لایا تھا لیکن کیا پتہ تھا کہ خود فرزندان توحید ہی اس طلسمی جال میں پھنس کر رہ جائیں گے اقبال ملت مرحومہ کو بیداری کا پیغام دیتے ہوئے فرماتے ہیں۔

نہیں ترا نشیمن قصر سلطانی کے گنبد پر　　تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں

بال جبرئیل ۴۴۸

محنت و سحر خیزی سے دوری:

دورہ حاضر میں مسلمانوں کی شکست وزوال کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ مسلمان محنت ومشقت اور سحر خیز جیسی نعمت سے دور ہوکر بے عملی اور آرام طلبی کی زندگی میں مبتلا ہوگیا جبکہ مسلمان کی کامیابی اور پہچان اسی محنت کشی اور سحر خیزی میں نہفتہ تھی شاید اسی لئے اقبال کی نظر اس مرد مجاہد کی تلاش میں سرگرداں تھی جس میں محنت کشی کا حوصلہ اور سحر خیزی کا ولولہ ہو آپ فرماتے ہیں۔

خریدیں نہ جس کو ہم اپنے لہو سے　　مسلمانوں کو ہے ننگ وہ بادشاہی

بال جبرئیل ۳۸۱

دنیا میں مقام حاصل کرنے کے لئے جس قدر محنت کشی کی ضرورت ہے اسی قدر روح کی تازگی اور تجدید عہد کی خاطر سحر خیزی بھی ضروری ہے۔

عطار ہو، رومی ہو، رازی ہو، غزالی ہو　　کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہِ سحر خیزی

بال جبرئیل ۳۸۵

عزم کی کمی:

مغربی تہذیب نے مسلمانوں کے دوسرے اقدار کے ساتھ ساتھ اس کی زندہ دلی اور عزم پائدار بھی اس سے چھین لیا مسلمان اس بلند پرواز پرندہ کی مثال بن گیا جسکے بال یا کاٹ دئے گئے ہوں یا پھر باندھ دئے گئے ہوں۔

محبت کا جنوں باقی نہیں ہے　　مسلمانوں میں خوں باقی نہیں ہے

صفیں کج، دل پریشاں، سجدے بے ذوق　　کہ جذبِ اندروں باقی نہیں ہے

بال جبرئیل ۴۱۰

نتیجہ میں مسلمان اپنے مقام ومنزلت کو کھو بیٹھا۔

اے لا الہٰ کے وارث باقی نہیں ہے تجھ میں گفتارِ دلربانہ کردارِ قاہرانہ
تیری نگاہ سے دل سینے میں کانپتے تھے کھویا گیا ہے تیرا جذب قلندرانہ
بال جبرئیل۳۸۴

اقبال قوم میں بیداری کی روح پھونکتے ہوئے فرماتے ہیں۔

اگر لہو ہے بدن میں تو خوف ہے نہ ہراس اگر لہو ہے بدن میں تو دل ہے بے وسواس
جسے ملی یہ متاعِ گراں بہا اس کو نہ سیم و زر سے محبت، ہے نے غمِ افلاس
بال جبرئیل۴۹۳

جس قوم میں خودی کا رنگ پایا جاتا ہے وہ کبھی عزمِ محکم سے محروم نہیں ہوتی بلکہ صورتِ شاہیں بلندیوں پر بسیرا کرتی ہے۔

اس قوم کو شمشیر کی حاجت نہیں ہوتی ہو جس کے جوانوں کی خودی صورت فولاد
شاہیں کبھی پرواز سے تھک کر نہیں گرتا پر دم ہے اگر تو تو نہیں خطرہ افتاد
ضرب کلیم۵۸۶

فتح و ظفر اسی کا طواف کرتی ہے جہاں عزم و ارادہ محکم پایا جاتا ہے

برہنہ سر ہے تو عزمِ بلند پیدا کر یہاں فقط سرِ شاہیں کے واسطے ہے کلاہ
بال جبرئیل۳۷۸

اقبال قوم کے درد کا یوں درمان کرتے ہیں اور مسلمانوں میں عزم زندہ و ارادہ نو کی تازہ روح پھونکتے نظر آتے ہیں۔

نہ تو زمیں کے لئے ہے نہ آسماں کے لئے جہاں ہے تیرے لئے تو نہیں جہاں کے لئے
رہے گا راوی و نیل و فرات میں کب تک ترا سفینہ کہ ہے بحر بیکراں کے لئے

نشانِ راہ دکھاتے تھے جو ستاروں کو ترس گئے ہیں کسی مردِ راہ داں کے لئے
نگہ بلند، سخن دل نواز، جاں پرسوز یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لئے

بال جبرئیل ۳۸۰

یا کبھی اس انداز میں فرمایا:

ضمیرِ لا الہ میں روشن چراغِ آرزو کر دے چمن کے ذرے ذرے کو شہیدِ جستجو کر دے

بانگ درا ۲۹۸

خانقاہی نظام کا غلبہ:

ہندوستان میں مسلم سماج کی پس ماندگی اور زوال کا ایک راز خانقاہی نظام کا رواج رہا ہے نتیجہ میں فلک نشین افکار خانقاہوں کی دیواروں میں محدود ہو کر رہ گئے لوگ باہر کی دنیا اور وقت کے تقاضوں سے بے خبر ہو کر رفتہ رفتہ اپنی بربادی و تباہی کی راہ ہموار کرتے رہے

رہا نہ حلقہ صوفی میں سوزِ مشتاق فسانہ ہائے کرامات رہ گئے باقی
خراب کوشکِ سلطان و خانقاہ فقیر فغاں کے تخت و مصلی کمالِ رزاقی
کرے گی داورِ محشر کو شرم سار اک روز کتابِ صوفی و ملا کی سادہ اوراقی

بال جبرئیل ۳۹۳

اگر مدارس راعنائی آفکار سے محروم ہوئے تو خانقاہ لذت اسرار سے۔

مکتبوں میں کہیں رعنائی افکار بھی ہے خانقاہوں میں کہیں لذتِ اسرار بھی ہے

بال جبرئیل ۳۹۲

لہذا عظمت رفتہ کو حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ افکار کو خانقاہوں کے در و دیوار سے آزاد کیا جائے تخیل کو پرواز کی اجازت دی جائے۔

اے پیرِ حرم رسم و رہ خانقہی چھوڑ مقصود سمجھ میری نوائے سحری کا

اللہ رکھے تیرے جوانوں کو سلامت　　دے انکو سبق خود شکنی خود نگری کا
تو اس کو سکھا خار شگافی کے طریقے　　مغرب نے سکھایا انہیں فن شیشہ گری کا
دل توڑ گئی ان کا تو صدیوں کی غلامی　　دارو کوئی سوچ ان کی پریشاں نظری کا

ضرب کلیم ۵۷۱

ضروری ہے کہ مدارس و خانقاہوں کو روایتی قید و بند سے آزاد کیا جائے ورنہ آنے والا کل ہمیں تباہی کے کس موڑ پر لے جائے نہیں معلوم۔

کئے ہیں فاش رموز قلندری میں نے　　کہ فکر مدرسہ و خانقاہ ہو آزاد

بال جبرئیل ۳۹۶

خانقاہوں کی در و دیوار سے نکل کر افکار و تدبر کی آزادی کا نتیجہ رسم و اداب شبیریؑ سے بہتر اور کیا ہو سکتا ہے۔

نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسمِ شبیریؑ　　کہ فکرِ خانقاہی ہے فقط اندوہ و دلگیری
ترے دین و ادب سے آرہی ہے بوے رہبانی　　یہی ہے مرنے والی امتوں کا عالم پیری

ارمغان حجاز ۷۱۴

مدارس کے زوال کے بادل :

مدارس جو تخلیق افکار اور انسان سازی کا پایہ دار مرکز ہوا کرتے تھے زمانے کے بدلاؤ کے ساتھ ساتھ مدرسوں کا مستقبل بھی خطرے میں پڑ گیا مدرسوں میں بھی رکود و جمود کا نظام قائم ہو گیا نتیجہ میں رفتہ رفتہ اس کی عظمت، اس کا مقام کم ہوتا چلا گیا جس کے اثرات مختلف صورتوں میں سامنے آئے کبھی اہل نظر کی کمی کا احساس تو کبھی فکر میں ناپختگی۔ کبھی افکار میں محدودیت تو کبھی کردار میں گراوٹ نظر آئی۔

ترقی کا آسمان صاف تو ہوا پر مدارس سے زوال کے بادل نہ چھٹے آج بھی مدارس کے مقدر اپنی بے بسی کا ماتم کر رہے ہیں جس کا بولتا ثبوت مدارس میں موجودہ کہنہ نظام و نصاب تعلیم ہے۔

پختہ افکار کہاں ڈھونڈنے جائے کوئی　　اس زمانے کی ہوا رکھتی ہے ہر چیز کو خام

مدرسہ عقل کو آزاد تو کرتا ہے مگر　　چھوڑ جاتا ہے خیالات کو بے ربط و نظام

ضربِ کلیم ۵۹۴

مدارس میں فکری محدودیت اور پسماندگی کا یہ عالم ہے کہ جو اسرار کوہ و بیابان میں بھی فاش ہیں طلاب مدارس پر پوشیدہ نظر آتے ہیں۔

مدرسے نے تری آنکھوں سے چھپایا جن کو　　خلوتِ کوہ و بیاباں میں وہ اسرار ہیں فاش

ضربِ کلیم ۵۹۷

علم و معرفت کا مرکز رہنے والے مدارس اپنی راہ سے منحرف ہو گئے وہاں تو اب طائر تنگ نظر کا بسیرا ہوگا۔

نہ ہے ستاروں کی گردش، نہ بازی افلاک　　خودی کی موت ہے تیرا زوال نعمت و جاہ

اٹھا میں مدرسہ و خانقاہ سے غمناک　　نہ زندگی نہ محبت نہ معرفت نہ نگاہ

بال جبرئیل ۳۷۸

علم و عمل کے شاہکار رہنے والے مدارس آج اپنی بربادی و تباہی پر ماتم کناں ہیں۔

مکتبوں میں کہیں رعنائی افکار بھی ہے　　خانقاہوں میں کہیں لذتِ اسرار بھی ہے

بڑھ کے خیبر سے ہے یہ معرکہ دین و وطن　　اس زمانے میں کوئی حیدرِ کرارؓ بھی ہے

بال جبرئیل ۳۹۲

یہ سب اس لئے ہے کیونکہ مدارس روایتی انداز اختیار کر چکے ہیں جب کہ زمانے کے تغیر کا ہر روز اپنے دامن میں ایک نیا تقاضا لئے کھڑا ہے ایسے حالات میں مدارس کی ناکامی کے آثار نمایاں ہیں۔

دنیا ہے روایات کے پھندوں میں گرفتار　　کیا مدرسہ کیا مدرسہ والوں کی تگ و دَو

کر سکتے تھے جو اپنے زمانے کی امامت　　وہ کہنہ دماغ اپنے زمانے کے ہیں پیرو

ضربِ کلیم ۵۹۸

اقبال مدارس کی بدحالی کی منظر کشی کبھی ان الفاظ میں کرتے نظر آتے ہیں۔

کھونا جا اس سحر و شام میں اے صاحبِ ہوش　　اک جہاں اور بھی ہے جس میں نہ فردا ہے نہ دوش
کس کو معلوم ہے ہنگامہ فردا کا مقام　　مسجد و مکتب و مے خانہ ہیں مدت سے خاموش

بال جبرئیل ۳۹۹

مدارس کے زوال کے اثرات مندرجہ ذیل صورت میں دیکھتے جا سکتے ہیں:

۱۔ علم کی فراوانی لیکن اھل نظر کا فقدان :

تعلیم حاضر نے اپنا معجزہ دکھایا گھر گھر تعلیم پہنچی لیکن اہل نظر افراد کی تعداد میں روز بروز کمی ہی ہوتی گئی کیونکہ لوگوں کی فکریں مادہ اور مادیات میں الجھ کر رہ گئیں اقبال اس حقیقت کی عکاسی اس طرح کرتے۔

زندگی کچھ اور شے ہے علم ہے کچھ اور شے　　زندگی سوزِ جگر ہے علم ہے سوزِ دماغ
اہلِ دانش عام ہیں کمیاب ہیں اہلِ نظر　　کیا تعجب ہے کہ خالی رہ گیا تیرا ایاغ

ضرب کلیم ۵۹۲

۲۔فکر میں استحکام کی کمی :

ہندوستانی مسلمان کے زوال کا ایک بڑا سبب فکر و تدبر کا بحران رہا ہے لہذا کہیں سرے سے فکر کا کال رہا تو کہیں غیر مستحکم افکار کا دور دورہ دونوں ہی اس صورتوں میں مسلمان اپنی پسماندگی سے فلاح حاصل نہ کر سکا۔

آزادی افکار سے ہے ان کی، تباہی　　رکھتے نہیں جو فکر و تدبر کا سلیقہ
ہو فکر اگر خام تو آزادیِ افکار　　انسان کو حیوان بنانے کا طریقہ

ضرب کلیم ۵۸۹

یہ سب اس لئے تھا کیونکہ افکار و تدبر کی تخلیق جہاں سے عالم وجود میں آتی ہے وہ اپنے زوال سے روبرو یعنی مدرسے اپنے حال پر ماتم کناں تھے۔

۳۔ افکار میں محدودیت :

مدارس کے زوال کا اثر افکار کی محدودیت کی شکل میں ظاہر ہوا یا یوں کہیں افکار کی محدودیت مدارس کے

زوال کا پیش خیمہ بنی بہرصورت نقصان تو قوم کا ہی ہوا چاہے چاقو خربوزے پر گرے یا خربوزہ چاقو پر، کٹنا خربوزے کو ہی ہے یہی حال دور حاضر میں ہماری قوم کا ہے۔

شیخِ مکتب کے طریقوں سے کشادِ دل کہاں　　کس طرح کبریت سے روشن ہو بجلی کا چراغ

ضرب کلیم ۵۹۲

کیوں نہ عالم اسلام اپنی بربادی کا ماتم کرے جب رہبران قوم کی فکری محدودیت کا یہ عالم ہے کہ:

ملا کو جو ہے ہند میں سجدوں کی اجازت　　ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

ضرب کلیم ۵۴۸

اقبال فکری محدودیت اور مسلمانوں کی نافہمی کو ایک دوسرے انداز میں اس طرح بیان کرتے ہیں۔

یہ مصرعہ لکھ دیا کس شوخ نے محرابِ مسجد پر　　یہ ناداں گر گئے سجدوں میں جب وقتِ قیام آیا

بال جبرئیل ۳۸۶

یہ محدودیت وغلامانہ افکار ہمیشہ قوم کو کسی نہ کسی صورت میں نقصان پہونچاتے رہے قوم میں انتشار اور اس کی بربادی میں اس رویہ کا ایک اہم کردار رہا ہے لہذا ان سے بچاؤ قوم کا ایک لاینفک فریضہ ہے۔

محکوم کے الہام سے اللہ بچائے　　غارتِ گر اقوام ہے وہ صورت چنگیز

ضرب کلیم ۵۶۷

لہذا ضروری ہے مدارس کے نظام ونصاب میں تجدید نظر کی جائے اس کو دور حاضر کے تقاضوں کا جواب دہ بنایا جائے اس کی بنیاد مضبوط کی جائے اس کے طائران تخیل کو قوت پرواز سے نوازہ جائے تاکہ عالم اسلام دوبارہ اس کے سایہ قیادت میں اپنی منزل مقصود کو پاسکے اور زمانہ اس کے فواید کا کلمہ پڑھتا نظر آئے۔

اس کے نفس گرم کی تاثیر ہے ایسی　　ہو جاتی ہے خاک چمنستاں شرر آمیز

شاہیں کی ادا ہوتی ہے بلبل میں نمودار　　کس درجہ بدل جاتے ہیں مرغان سحر خیز

اس مرد خود آگاہ وخدامست کی صحبت　　دیتی ہے گداؤں کو شکوہ جم و پرویز

ضرب کلیم ۵۶۷

٤۔ علماء سے عوام کی دوری :

ادھر علماء کے افکار میں محدودیت کا اثر بڑھتا گیا ادھر عوام کی ان سے دوری بڑھتی گئی علماء کرام درک و درد کی لذت سے دور عیش وتجملات میں گرفتار ہوتے نظر آئے نتیجہ میں اس کی زبان کی تاثیر ضائع ہوگئی قبال اس حقیقت کی عکاسی یوں کرتے نظر اتے ہیں۔

فتوی ہے شیخ کا یہ زمانہ قلم کا ہے　　دنیا میں اب رہی نہیں تلوار کارگر
لیکن جنابِ شیخ کو معلوم کیا نہیں　　مسجد میں اب یہ وعظ ہے بے سود و بے اثر

ضرب کلیم ۵۴۰

علماء میں فکر محدودیت کا دائرہ روز بروز بڑھتا گیا سنجیدہ فہم واوراک کے مالک افراد بھی رفتہ رفتہ مدارس سے کنارہ کشی پر آمادہ ہوگئے۔

نہ فلسفی سے نہ ملا سے ہے غرض مجھکو　　یہ دل کی موت وہ اندیشہ ونظر کا فساد
فقیہ شہر کی تحقیر کیا مجال میری　　مگر یہ بات کہ میں ڈھونڈتا ہوں دل کی کشاد

بال جبرئیل ۳۹۶

ظاہر سی بات ہے جہاں پر ایسے افکار کے مالک افراد قوم کی قیادت کریں وہاں یقیناً قوم زوال وپس ماندگی کے روبرو ہوتی ہے۔

میں جانتا ہوں انجام اس کا　　جس معرکہ میں ملاّ ہوں غازی

بال جبرئیل ۳۹۷

اقبال علماء معاصر کے حال وروش پر یوں ماتم کناں نظر آتے ہیں۔

ہے مریدوں کو تو حق بات گوارا لیکن　　شیخ وملاّ کو بری لگتی ہے درویش کی بات
قوم کے ہاتھ سے جاتا ہے متاعِ کردار　　بحث میں آتا ہے جب فلسفہ ذات وصفات

ضرب کلیم ۵۹۰

لیکن شائد اسے معلوم نہیں۔

اس کی تقدیر میں محکومی و مظلومی ہے　　قوم جو کر نہ سکی اپنی خودی سے انصاف
فطرت افراد سے اغماض بھی کر لیتی ہے　　کبھی کرتی نہیں ملت کے گناہوں کو معاف

ضرب کلیم ۵۹۹

۵۔ خطابت کا بے اثر ہونا :

مدارس کے زوال کا اثر محراب و منبر پر بھی کافی پڑا نتیجہ میں پیکر ایمان و عمل میں زندہ دلی کی روح پھونکنے والی خطابت بے روح، بے اثر و ثمر نظر آئی۔

شعور و ہوش و خرد کا معاملہ ہے عجیب — مقام شوق میں ہیں سب دل و نظر کے رقیب
میں جانتا ہوں جماعت کا حشر کیا ہوگا — مسائل نظری میں الجھ گیا ہے خطیب

بال جبرئیل ۴۰۳

جب سے خطیب و فقیہ میں خانقاہی مزاج نے جنم لیا محراب و منبر اپنی افادیت کھو بیٹھے۔

سکھا دئے ہیں اسے شیوہ ھای خانقاہی — فقیہ شہر کو صوفی نے کر دیا ہے خراب
وہ سجدہ روح زمیں جس سے کانپ جاتی تھی — اسی کو آج ترستے ہیں منبر و محراب

بال جبرئیل ۳۷۱

۶۔ شاعری کا بے ہدف ہونا :

مدارس کے زوال کا اثر شاعری کی دنیا میں بھی دیکھنے کو ملا شاعری جو ملت کی بیداری میں بہترین کردار ادا کرتی تھی روایتی رنگ و بو میں اسیر ہو کر رہ گئی۔

امینِ راز ہے مردانِ حر کی درویشی — کہ جبرئیل سے ہے اسکو نسبتِ خویشی
کسے خبر کے سفینہ ڈبو چکی کتنے — فقیہ و صوفی و شاعر کی نا خوش اندیشی

بال جبرئیل ۳۷۰

اقبال شاعری کی زبوں حالی کو کبھی اس انداز میں بیاں کرتے ہیں۔

صوفی کی طریقت میں فقط مستی کردار — ملاّ کی شریعت میں فقط مستی گفتار
شاعر کی نوا مردہ و افسردہ و بے ذوق — افکار میں سرمست نہ خوابیدہ نہ بے دار

ضرب کلیم ۵۵۲

۷۔ بے عملی کا رواج :

مدارس کے زوال کے ساتھ ساتھ لوگوں میں بے عملی اور بے روح عبادت کا دور شروع ہوا ۔

عجب نہیں کہ خدا تک تری رسائی ہو　　تری نگاہ سے ہے پوشیدہ آدمی کا مقام
تری نماز میں باقی جلال ہیں نہ جمال　　تری اذاں میں نہیں ہے مری سحر کا پیام
ضرب کلیم ۵۳۶

اقبال قوم کی بے عملی کے درد کا مداوا اس طرح کرتے نظر آتے ہیں۔

بدل کر بھیس پھر آتے ہیں ہر زمانہ میں　　اگر چہ پیر ہے آدم جواں ہیں لات و منات
یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے　　ہزار سجدے سے دیتا ہے آدمی کو نجات
ضرب کلیم ۵۵۰

۸۔ اقبال کا درس عزم:

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں　　ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں
تہی زندگی سے نہیں یہ فضائیں　　یہاں سینکڑوں کارواں اور بھی ہیں
قناعت نہ کر عالم رنگ و بو پر　　چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں
اگر کھو گیا اک نشیمن تو کیا غم　　مقامات آہ و فغاں اور بھی ہیں
تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا　　تیرے سامنے آسماں اور بھی ہیں
اسی روز و شب میں الجھ کر نہ رہ جا　　کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں

۹۔ اقبال کا پیغام آخر:

بال جبرئیل ۳۹۰

اٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے　　مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے
بانگ درا ۲۹۲

حوالہ جات:

۱۔ اقبال شاعر و مفکر، نور الحسن نقوی ۱۹۹۲ء علی گڑھ ایجوکیشنل بک ہاوس
۲۔ ایضا
۳ ایضا
۴۔ ایضا
۵۔ ایضا
۶۔ ایضا

اتحاد کے علمبردار

عبدالرحمٰن کواکبی، مصلح ومجاہد عالم
اور
استبداد کے دشمن

عزالدین رضانژاد
(حوزہ ویونیورسٹی کے استاد، مرکز جہانی علوم اسلامی (قدیم) کی ہیئت علمی کے رکن)
ترجمہ: منور حسین ناصری
(چیرمین آل البیتؑ انسٹیٹیوٹ فار پروپیگیشن، گائڈینس اینڈ ویلفیئر افیرس)

خلاصہ:

تاریخ میں دینی علماء نے جو ہدایت کا چراغ روشن کیا ہے اس کے آثار ونتائج آج بھی بخوبی محسوس کئے جاسکتے ہیں۔ اسے حاصل کرنا دانشوروں اور طالب علموں کا بھی آج تک معمول رہا ہے۔

انہیں علماء نے بشریت کی میں اصلاح کرنے اور ڈکٹیٹروں سے مقابلہ کرنے کی بھی کوششیں کی ہیں۔

تیرہویں صدی میں ہم نے ایک ایسے مصلح کو بھی دیکھا ہے جنہوں نے مختلف طبقات سے اتحاد وہم دلی کرنے کے ساتھ ساتھ لوگوں کو مصالحت آمیز زندگی گزارنے کے طریقوں کی نشاندہی کی ہے۔ اس تحریر میں ان مصلح ومجاہد اور استبداد کے دشمن عالم کی

زندگی کا ایک خاکہ بیان کیا جارہا ہے۔

۱۔ولادت:

۱۲۷۱ہجری قمری مطابق ۱۸۵۴ء میں حلب شہر (شام) کے ایک علم وادب اور محترم خاندان میں ان کی ولادت ہوئی یہ وہ خاندان ہے جس کا سلسلۂ نسب امام علیؑ تک پہنچتا ہے۔ان کے والد کا نام احمد بن محمد بن مسعود کواکبی اور والدہ عفیفہ مسعود آل نقیب تھیں جو کہ شام کے انطاکیہ شہر کے مفتی کی بیٹی تھیں۔

۲۔تعلیم وتربیت:

عبدالرحمٰن نے بچپن سے ہی تعلیم شروع کی۔ چھ سال کی عمر میں آپ اپنی ماں کے سایۂ مہر سے محروم ہو گئے ۔جس کے بعد ان کی خالہ صفیہ انہیں اپنے ساتھ انطاکیہ لے گئیں اور تین سال تک ان کی تربیت میں مصروف رہیں ۔نو سال کی عمر میں عبدالرحمٰن کواکبی حلب واپس آئے اور شیخ طاہر کلزی کے پاس مختلف علوم حاصل کرنا شروع کئے۔ لکھنا پڑھنا سیکھنے کے بعد قرائت قرآن پر کام کیا اور قرآن کو حفظ کرلیا۔ پھر اپنی خالہ کے یہاں واپس چلے گئے، تاکہ وہ ان کی علمی ترقیوں کو زیرنظر رکھیں۔ان کی خالہ نے نجیب نقیب جیسی شخصیت سے مدد لی تاکہ عبدالرحمٰن کی تعلیم و تربیت کا سلسلہ تیزی سے آگے بڑھ سکے۔

آپ مختلف علوم حاصل کرنے کے بعد حلب واپس آئے اور چونکہ انہیں شریعت، ادبیات اور علوم طبیعی (طبیعیات) وغیرہ جیسے مختلف علوم حاصل کرنے کا بہت شوق تھا لہذا انہوں نے ''المدرسۃ الکواکبیۃ'' نامی ایک دینی مدرسہ میں داخلہ لیا۔

ان چند سالوں کے دوران ان کے والد اور حلب کے بڑے دانشوروں کے ایک گروہ نے ان کی تدریس اور دیگر امور کی نگرانی شروع کی۔

انہوں نے صرف مدرسہ کی تعلیمات پر اکتفاء نہیں کی بلکہ کواکبی لائبریری سے استفادہ کرتے ہوئے اپنی فکری صلاحیتوں کو مزید ارتقاء بخشی اور اس طرح سیاسی، اجتماعی، تاریخی اور فلسفی علوم میں اچھی خاصی معلومات حاصل

کیں ۔ یہ کواکبی لائبریری ایسی لائبریری تھی جس میں قدیم و جدید قلمی آثار ہی موجود نہیں تھے بلکہ کتابوں کی چھپائی بھی ہوا کرتی تھی ۔

۳۔مختلف جرائد و مجلّات کے ساتھ تعاون:

عبدالرحمٰن کواکبی نے اپنی علمی زندگی کا آغاز مختلف مجلّات و جرائد کے لئے مقالہ نویسی سے کیا۔آپ ۲۲ر سال کی عمر میں مجلہ ''الفرات'' (جو حلب شہر میں دو زبانوں: ترکی و عربی میں شائع ہوتا تھا) کی قلمی انجمن کے رکن منتخب ہوئے ۔ان کے مقالات جو حکام وقت کی تباہ کاریوں اور ان کے فسادات کو فاش کیا کرتے تھے ان کی شہرت کے باعث بنے ۔سعد زغلول (عبدالرحمٰن کواکبی کے پوتے) کے قول کے مطابق عبدالرحمٰن تقریباً دو سال حکومت سے امداد یافتہ مجلّہ ''الفرات'' میں کام کرتے رہے ۔ان دنوں انہوں نے یہ محسوس کیا کہ حکومتی مجلّات میں کام کرنا عمومی افکار کو روشن کرنے اور صحیح اخبار شائع کرنے میں رکاوٹ بنتا ہے کیونکہ ایسے جرائد و مجلّات حکومت وقت کے مقاصد کی راہ میں کام کرتے ہیں ۔اسی لئے انہوں نے فیصلہ کیا کہ کوئی دوسرا خصوصی اخبار شائع کیا جائے ، چنانچہ انہوں نے ۱۸۷۷ء میں ''الشہباء'' نامی ایک مجلّہ شائع کیا (جو حلب شہر میں عربی میں پہلا مجلّہ تھا) اور اسے چھاپنے کی اجازت لینے کی خاطر اپنے دوستوں میں سے کسی کے نام پر رجسٹرڈ کرالیا۔مگر حاکم وقت (کمال پاشا) عبدالرحمٰن کواکبی کے جرأتمندانہ اعتراضات برداشت نہیں کر پائے جس کے نتیجہ میں اس مجلّہ کا پندرہواں شمارہ شائع ہو جانے کے بعد حاکم وقت کی طرف سے اس پر پابندی لگا دی گئی ۔

عبدالرحمٰن کواکبی کو مقالہ نویسی اور نامہ نگاری سے زیادہ لگاؤ تھا اسی وجہ سے انہوں نے اپنے وقت کی ڈکٹیٹر شپ کے خلاف اپنا قلمی جہاد جاری رکھا ،عبدالرحمٰن نے ۱۸۷۹ء میں اپنے دوسرے دوست کے نام پر مجلۂ ''الشہباء'' کی طرح ایک اور مجلّہ ''اعتدال'' کے نام رجسٹرڈ کرا کے شائع کیا مگر اسے بھی زیادہ دیر تک جاری نہیں رکھ سکے بلکہ اس پر بھی شریف پاشا کی طرف سے پابندی لگا دی گئی ۔

جب ان کے دووں مجلوں کو بند کر دیا گیا تو انہوں نے ''قانون'' سیکھنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ اپنی قابل تعریف علمی ترقی کی بدولت آپ حلب شہر (شام) میں دو انجمنوں (انجمن اقتصادی و معارف علمی) کے رکن منتخب

ہوئے اوراس کے بعد آپ حلب شہر میں ''ممتحنین وکلاء کمیٹی'' کے اعزازی رکن چنے گئے۔

جب انہوں نے یہ دیکھا کہ حکومت ان کے نظریاتی اور علمی ومطبوعاتی منصوبوں میں رکاوٹ بننے کے ساتھ ان کے مثبت کاموں میں بھی رکاوٹ بن رہی ہے، تو آپ فوراً ان امور سے دستبردار ہوگئے اور حلب شہر میں اپنے گھر کے نزدیک وکالت کا دفتر کھول لیا تاکہ اس میں بیٹھ کر بغیر کسی مالی غرض کے شہر کے لوگوں کی حمایت کرتے ہوئے مظلوموں اور مستضعفین کی مدد کریں۔اسی لئے مظلومین انہیں ''پدر مستضعفین'' کے لقب سے پکارا کرتے تھے۔

۴۔ڈکٹیٹرشپ کے خلاف علمی اور عملی جہاد:

کواکبی نے حکومت اور ظالم حکمرانوں کے خلاف لکھنے میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی جس کی وجہ سے آپ حلب میں حکومت عثمانی کی طرف سے ہمیشہ دباؤ میں رہے اور آپ کو ۱۸۹۹ء مطابق ۱۳۱۶ھ میں اپنا ملک چھوڑ کر خفیہ طور پر مصر ہجرت کرنا پڑی، آپ نے ایشیا کے کئی ملکوں مثلاً ہندوستان، چین اور مشرق وسطیٰ کے سواحلی علاقوں نیز افریقہ کے سواحلی علاقوں (جن پر سلطان عبدالحمید کی براہ راست نگرانی نہیں تھی) میں بھی سفر کیا۔اور وہاں ایک بڑا گروہ آپ کا شاگرد بنا جس کے بعد آپ اپنے زمانہ کے بزرگ عالموں کی صف میں شامل ہوگئے اور آخر کار مصر میں آپ کی شہرت بہت بڑھ گئی۔

عبدالرحمٰن کواکبی کی بہترین اور معروف ترین کتاب ''طبائع الاستبداد ومصارع الاستعباد'' ہے۔انہوں نے اپنی اس کتاب میں استبداد اور ڈکٹیٹرشپ کے بدترین دور کی تاریخ کے چہرے سے نقاب ہٹادی ہے۔

عبدالرحمٰن کواکبی نے اپنے سفر کے دوران دینی افکار کی ترویج، لوگوں کو جہالت سے دور کرنے کی اصلاحات کے سوا کچھ نہیں کیا۔ان کی نگاہ میں دنیائے اسلام اگر انحطاط کی طرف جارہی ہے تو اس کی اصل وجہ مستبد اور ڈکٹیٹر حکومتوں کا ہونا ہے لہذا موجودہ صورت حال سے چھٹکارا حاصل کرنے کا واحد راستہ ان سے مقابلہ اور جہاد کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔

مذکورہ کتاب نے اصلاح پسندوں اور اہل علم کے سامنے بہترین دروازے کھول دیئے ہیں۔کہتے ہیں کہ: استاد شہید حسن البنا نے ''طبائع الاستبداد'' کتاب سے الہام لے کر ''جمعیت اخوان المسلمین'' کی بنیاد رکھی ہے۔

کواکبی نے دنیائے اسلام میں موجود مسائل پر کسی حد تک خصوصی نگاہ رکھی جس کی وجہ سے آپ عصر حاضر کے مصلحین میں شمار ہوئے۔

۵۔استبدادی حکومتیں:

معاشرتی اصلاح کے متعلق عبدالرحمٰن کواکبی کے کردار اور مستبد حکومتوں کے بارے میں ایک اجمالی رپورٹ اور انہیں امور سے متعلق ان کا نظریہ یہاں بیان کیا جارہا ہے۔

استبداد لغت میں:

لغت میں استبداد سے مراد یہ ہے کہ ایک شخص کو کسی کام میں مشورہ لینا مناسب تھا لیکن اس نے کسی سے مشورہ لئے بغیر اپنی رائے پر اکتفا کیا۔مگر جہاں استبداد بطور مطلق ذکر ہو اس سے مراد مستبد حکمران ہے کیونکہ عوام کی بدبختی کا سب سے بڑا سبب وہی مستبد حاکم ہے، اس کے علاوہ بعض مذاہب کے سربراہوں یا بعض طائفوں اور گروہوں کی حکمرانی کے لئے بھی بطور مجاز استبداد کی صفت استعمال کی جاتی ہے۔

سیاستدانوں کی اصطلاح میں استبداد سے مراد:

ایک شخص یا ایک گروہ کا اپنی قوم کے حقوق میں کسی خوف و ہراست کے بغیر تصرف کرنا ہے، استبداد، ایک آزاد اور مطلق العنان حکمران کی صفت کا نام ہے کہ جو عوام کے تمام امور میں کسی بھی حساب وسزا کے خوف کے بغیر جیسے خود چاہے تصرف کرے۔

استبداد کا منشأ یہ ہے کہ حکمران اس بات کا پابند نہیں ہے کہ اپنی من مانی کو شریعت یا قانون یا قومی ادارہ کے قانون سے ہم آہنگ کرے ۔استبداد کی یہ صفت جس طرح ایک مطلق العنان فرد کی حکمرانی اور سلطنت کو شامل ہے (جو عوام پر غلبہ پا کر یا میراث کے ذریعہ سلطنت کا متولی بن جاتا ہے) اسی طرح اس فرد کی حکمرانی کو بھی شامل ہے جو انتخابات کے ذریعہ سلطنت حاصل کرتا ہے لیکن کوئی اس سے حساب نہیں لیتا ہے۔اس کے علاوہ یہ صفت ایک گروہ

کی مطلق العنان حکمرانی کو بھی شامل ہے اگر چہ وہ گروہ منتخب ہی کیوں نہ ہوا ہو، کیونکہ یہ گروہ استبداد کو دور کرنے یا ختم کرنے میں شریک نہیں ہوتا ہے۔ ہاں، ممکن ہے کہ اسے اجمالی طور پر تخفیف دے اور اکثر ایک گروہ کی حاکمیت ایک شخص کے استبداد سے زیادہ سخت اور نقصان دہ ہوا کرتی ہے۔ اسی طرح استبداد کی یہ صفت ایک ایسی مشروطہ سلطنت کو بھی شامل ہے جس میں شریعت اور قانون دونوں، انتظامیہ (احکام جاری کرنے والا محکمہ) سے جدا ہوتے ہیں کیونکہ اس سے بھی استبداد ختم نہیں ہوتا ہے اور نہ اس میں اسے تخفیف ہوتی ہے۔

جب تک انتظامیہ، مقنّنہ کے نزدیک اور مقنّنہ اپنے آپ کو عوام کے سامنے ذمہ دار نہ سمجھے اور اسی طرح جب تک قوم یہ نہ سوچے کہ کیسے ان اداروں کی حفاظت کی جائے اور کیسے ان سے حساب لیا جائے تب تک کوئی سلطنت کسی استبداد سے خالی نہیں ہوسکتی ہے۔

جو کچھ ذکر ہوا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ سلطنت جیسی بھی ہو جب تک اس کی اچھی طرح نگرانی نہ کی جائے اور کسی چشم پوشی کے بغیر محاسبہ نہ کیا جائے اس وقت تک وہ حکومت استبداد کی صفت سے خالی نہیں رہتی ہے۔

مقررہ امور میں سے ایک یہ ہے کہ ہر عادل سلطنت جب تک اپنی ذمہ داری کو نہ جانے اور اپنی قوم کے مواخذہ سے محفوظ رہے اور قوم اس کا مواخذہ کرے تو وہ سلطنت بہت استبدادی ہو جاتی ہے اور ایسا حاکم تخت نہیں چھوڑتا جب تک اس کے پاس دو خطرناک قوتیں ہوں۔ ان دو خطرناک قوتوں سے مراد قومی غفلت و نادانی اور منظّم سپاہ کا وجود ہے۔

(ر.ک: طبائع الاستبداد انٹرنٹ، www.hawzah-net)۔

۶۔ استبداد سے مقابلہ کرنے کے لئے سیاسی آگاہی و بصیرت کی ضرورت:

عبدالرحمٰن کواکبی سید جمال کی طرح سیاسی آگاہی و بصریت کو تمام مسلمانوں کے لئے واجب سمجھتے تھے اور ان کا ماننا ہے کہ ''صرف سیاسی آگاہی و بصیرت سے ہی استبداد کو روکا نہیں جاسکتا بلکہ اور بھی امور ہیں جن پر عمل کرنا ضروری ہے''۔

ہر حکومت، استبدادی شکل اختیار کر سکتی ہے اور آخر کار جو چیز استبداد کو روک سکتی ہے وہ عوام کی سیاسی آگاہی ،شعور، بصیرت اور حاکم پر ان کی نگرانی ہے، جب ایسی آگاہی، احساس اور شعور عوام کے اندر پیدا ہو جائے تو استبداد کے کالے اژدھے کو قابو میں رکھا جا سکتا ہے ۔

البتہ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ حکومت سے کوئی تعلق نہ رکھا جائے اور حکومت جیسی بھی ہو ہونے دیں بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ عوام کے سیاسی شعور و بصیرت کی سطح اونچی ہو جانے سے استبداد ختم ہو کر رہ جاتا ہے۔

اس بنیاد پر کواکبی سید جمال کی طرح یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ عوام میں دینی شعور پھیلا کر اسی کے ذریعہ سیاسی شعور بھی ان کے اندر پیدا کیا جائے۔

کواکبی کا ماننا ہے کہ دین اور سیاست میں باہم ہماہنگی اور وابستگی ہے اور یہ دونوں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہیں لہذا دین اسلام ایک سیاسی دین ہے۔

کواکبی کا ماننا یہ بھی ہے کہ توحید اسلام کو اگر صحیح معنوں میں سمجھ لیا جائے اور عوام کلمہ توحید ''لا الٰہ الا اللہ'' کے حقیقی مفہوم کو درک کر لے تو استبداد کے خلاف ایک فوجی قلعہ کھڑا کیا جا سکتا ہے۔

دین، سیاسی میدان کو معاد و معاش، زندگی اور معنویت سے مربوط کر کے اس کے لئے راہ کھولتا ہے۔ مستبدین کو حکمت نظری، فلسفۂ عقلی، سیاست مدنی اور حقائق تاریخی وغیرہ جیسے علوم سے (جو جہالت کے بادلوں کو پراکندہ کر دیتے ہیں) سے ڈر لگتا ہے۔ سیاسی بصیرت و آگاہی کے ساتھ مسلمانوں کے درمیان وحدت و ہمبستگی اور ہمدلی مسلمانوں کی سرنوشت میں اچھا کردار ادا کر سکتی ہے اور جس کے نتیجہ میں سیاسی فیصلے بھی اچھی طرح کئے جا سکتے ہیں....

۷۔ تالیفات:

کواکبی نے قابل توجہ اور قابل تحسین کتابیں تالیف کی ہیں۔ ان کی تالیفات میں سے بعض کو یہاں ذکر کیا جا رہا ہے: طبائع الاستبداد، ام القریٰ، العظمۃ للہ، صحائف قریش.. اور ان کے علاوہ مسودات بھی بہت زیادہ ہیں لیکن چھپے نہیں ہیں۔ نیز یہ کہ ان کی یادداشت کی ڈائری گم ہو چکی ہے جس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا ہے۔

۸۔ وفات:

کواکبی چھ مہینے تک مختلف ایشیائی ملکوں اور افریقہ کی طرف سفر میں رہے اور وہاں سے واپس ہو کر تین مہینے گزر جانے کے بعد جمعرات کی شام کو ۱۴/۶/۱۹۹۲ء مطابق ربیع الاول ۱۳۲۰ھ میں (ایک قول کے مطابق) زہر کی وجہ سے دنیا سے رخصت ہوئے۔ اور خدیوی عباس کے خرچہ سے انہیں مقبرۂ باب الوزیر میں دفن کیا گیا، اور پھر ایک دینی رسم کے تحت ان کی قبر کی مٹی کو بزرگ لوگوں کی خصوصی قبرستان (جو شاہراہ عفیفی کے آخر میں موجود ہے) میں منتقل کیا گیا۔

عبدالرحمٰن کواکبی پسندیدہ اخلاق کے مالک تھے اسی لئے ہر وہ شخص جو انہیں جانتا تھا ان کی نیکیاں اور اچھائیاں بیان کرتا تھا۔ ان کے شاگردوں اور ان کے دور کے علماء نے تقریروں، مقالات اور علمی و اخلاقی تحریروں میں ان کے بہترین اخلاق کا ذکر کیا ہے۔ ان علماء اور شاگردوں کے اظہار کو شیخ عبدالحمید جابری، شیخ رشید رضا، ڈاکٹر اسعد کواکبی، ابراہیم سلیم نجار، محمد کرد علی اور علی فکری وغیرہ کی تقریروں میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

حافظ ابراہیم نامی ایک شاعر نے کواکبی کو دفن کرنے کے دن ان کی قبر کے کنارے بیٹھ کر مندرجہ ذیل اشعار پڑھے جسے بعد میں ان کی قبر کے لوح پر نقش کر دیا گیا:

''یہاں دنیا کا بہادر مدفون ہے، یہاں صاحب تقویٰ کی آرام گاہ ہے یہاں بہترین مظلوم ہے، یہاں بہترین کاتب ہے یہاں ٹھہر کر سورۂ فاتحہ پڑھو اور ان پر سلام بھیجو کیونکہ یہ قبر، کواکبی کی قبر ہے''[۱]۔

منابع و ماخذ:

۱۔ رافق، عبدالکریم، المشرق العربی فی العہد العثمانی، جامعۃ الدمشق، طبع پنجم۔
۲۔ کواکبی، عبدالرحمٰن، سیرۃ ذاتیۃ، دار بیسان، بیروت، طبع اول ۱۹۹۸ء۔
۳۔ عبدالرحمٰن الکواکبی، رجل الکفاح والاصلاح، مجمع جہانی تقریب مذاہب اسلامی، تہران، ۱۳۸۶ش۔
۴۔ http://www.geocities.com/handase/28.htm
۵۔ http://www.afdhl.com/islamic/show.php?id=589
۶۔ http://www.al-fateh.net/arch/fa-24/kawakibi.htm
۷۔ http://www.almujtamaa-mag.com/detail.asp?

۱۔ عبدالرحمٰن الکواکبی، رجل الکفاح والاصلاح، ۱۳۸۶، ص ۱۰۔

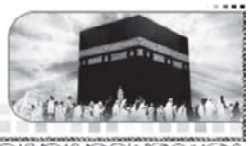

عالم اسلام کا تعارف

بحرین عہد قدیم سے اب تک

(پہلی قسط)

سید نجیب الحسن زیدی

خلاصہ:

پیش نظر مقالے میں بحرین کی اقلیمی اور جغرافیائی موجودہ حیثیت کو بیان کیا گیا ہے اور کوشش کی گئی ہے کہ بحرین کا ایک ایسا مختصر تعارف پیش کیا جا سکے جس کے ذریعہ بحرین کی اسٹراٹجک پوزیشن سامنے آنے کے ساتھ یہ پتہ چل سکے کہ عہد قدیم سے لے کر اب تک بحرین کو کس نظر سے دیکھا جاتا رہا ہے؟ چنانچہ بحرین کے مختصر تعارف کے بعد پہلے حصہ میں بحرین کی وجہ تسمیہ، اس کے سیاسی ڈھانچے اور وہاں سرگرم تنظیموں کا جائزہ لیا گیا ہے اور اس کے بعد بحرین کی ملکی تقسیم، زبان اور قدرتی ذخائر اقتصاد بیرونی سرمایہ کاری، بحرین کی بین الاقوامی معتبر اداروں میں رکنیت، تعلیمی کارکردگی و... پر ایک نظر ڈالی گئی ہے علاوہ از ایں عہد قدیم میں بحرین کے تمدن پر روشنی ڈالتے ہوئے عہد قدیم سے ظہور اسلام تک کا ایک اجمالی جائزہ بحرین میں خوارج کی حکومت سے صفوی دور حکومت تک کا ایک مختصر خاکہ اس تحریر کے مشمولات کا حصہ ہے۔

کلیدی الفاظ:

بحرین،عہد قدیم،خلیج فارس،تمدن، بین النہرین ،ملوک الطّوائف،قرامطہ

مختصر تعارف:

بحرین۲/۶۹۱ مربع کلومیٹر کے رقبہ پر محیط قطر اور سعودی عرب کے درمیان خلیج فارس میں واقع ایک ایسا چھوٹا سا ملک ہے جسے کبھی اوال بھی کہا جاتا تھا۔(اصطخری،ص/۳۲؛ابن حوقل،ص/۲۶۷ مقدسی/ص/۵۳،یاقوت حموی،معجم البلدان ج/۱،ص/۳۹۵)

بحرین کی جملہ آبادی بہ مشکل ۱۲ لاکھ ۳۴ ہزار افراد پر مشتمل ہے ۔اس میں بھی آدھی آبادی غیر ملکی مزدوروں اوران کے خاندانوں کی ہے بحرین کی کل آبادی میں تقریبا ۷۲/سے ۷۴/فیصد آبادی شیعہ ہے یہ مملکت ۳۳/چھوٹے چھوٹے جزیروں پر مشتمل ہے۔

اس کے مغرب میں سعودی عرب ہے اور یہ ۲۵ کلومیٹر طویل شاہ فہد پل{Cause way} کے ذریعہ بحرین سے جڑا ہوا ہے بحرین کے جنوب میں قطر واقع ہے

بحرین کے سب سے بڑے جزیرہ کا نام بھی بحرین ہے جسکا طول ۵۰ کلومیٹر اور عرض ۱۳ سے ۲۵ کلومیٹر ہے یہ جزیرہ بحرین کے کل رقبہ میں ۸۵/فیصد رقبہ پر پھیلا ہوا ہے۔(۔،دانشنامہ جہان اسلام ص/۳۳۰حرف ر ب،زیرنگرانی،غلام علی حداد عادل)بحرین کا علاقہ شمال،مغرب اور جنوب کی طرف سے بے آب وعلف صحراؤں اور ریگستانوں پر ختم ہوتا ہے جہاں سے مدینہ،حجاز،اور عمان کے لئے صعب العبور کاروانی راستے بھی نکلتے ہیں ،(۔جغرافیای تاریخی کشورھائے اسلامی دکتر حسین قرچانلو،ص/۲۳۱)

اسلام سے قبل اور صدر اسلام اور اس کے بعد بھی تقریبا ساتویں صدی ہجری تک بحرین کے علاقے کو بصرہ سے عمان تک خلیج فارس کے جنوبی ساحل کی تمام زمینوں پر محیط مانا جاتا تھا (دائرۃ امعارف بزرگ اسلامی،ص/۴۰۰ ذیل بحرین ، زیرنگرانی موسوی بجنوردی ،جغرافیای تاریخی کشور ھائے اسلامی دکتر حسین قرچانلو، ص/۲۳۱))جس کے قلمرو میں قطیف ،کویت،احساء کے ساتھ قطر بھی آتے تھے(دانشنامہ جہان اسلام حرف ب ص/۳۳۲،زیرنگرانی،غلام علی حداد عادل)

بحرین کی وجہ تسمیہ:

کسی زمانے میں بحرین کو ''اوال'' کے نام سے جانا جاتا تھا لیکن فی الحال بحرین کی وجہ تسمیہ کے سلسلہ میں نہیں کہا جا سکتا کہ اسے بحرین کیوں کہا جاتا ہے اگر چہ معروف یہ ہے کہ بحرین کو بحرین اس لئے کہا جاتا ہے کہ یہ دو سمندروں کے درمیان واقع ہے جبکہ تاریخی اور جغرافیائی لحاظ سے ایسا ہرگز نہیں ہے بحرین کو بحرین ''شاید اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس کے ایک طرف تو دریا ہے اور دوسری طرف یہ ایسے ریگستانی علاقوں سے گھرا ہوا ہے جو دور سے دریا کی طرح نظر آتے ہیں (جغرافیای تاریخی کشورھائے اسلامی دکتر حسین قرچانلو، ص/۲۳۱)

اس کے علاوہ یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ چونکہ جزیرہ اوال اور برفارس کے درمیان پانی کا ایک رنگ ہے اور برفارس سے برالعرب تک دوسرا پانی ہے اس لئے اسے بحرین کہا جاتا ہے (دانشنامہ جہان اسلام زیرنظر دکتر حدادعادل/ص/۳۳۲)

زبان اور ملکی تقسیم:

زبان: بحرین کی رسمی زبان عربی ہے لیکن اردو، فارسی اور انگریزی بھی یہاں پر کافی رائج ہے ملکی تقسیم کے اعتبار سے بحرین کے کل پانچ صوبے ہیں جو، جنوبی، شمالی، عاصمہ، محرق، اور وسطی کے نام سے جانے جاتے ہیں اور منامہ، محرق، مشرقی رفاع، مغربی رفاع، حمدسٹی، عیسی سٹی، الحد، حدفحص، عوالی، زایدسٹی، الزلاق، عراد، عوالی، البدیع پر مشتمل ۱۴ شہر ہیں۔

سیاسی ڈھانچہ

بحرین کے بنیادی دستورالعمل کے مطابق اس ملک کا سیاسی ڈھانچہ مقنّنہ، اجرائیہ، اور قضائیہ تین ارکان پر منحصر ہے اور کسی کو دوسرے کے امور میں مداخلت کا حق نہیں ہے (Country report} .Bahrain,Quarter 1995.p.3.)

اس ملک کا رسمی نام بحرین ہے اور اسے امارت بحرین کے نام سے جانا جاتا ہے امارت بحرین ۱۹۷۱ء میں مستقل امارت کے طور پر تشکیل پانے والا ملک ہے جس کے بنیادی دستورالعمل کو ۱۹۷۳ء میں نافذ کیا گیا ۱۹۷۳ء ہی میں بحرین کی پارلیمنٹ نے تیس منتخب نمائندوں کے ساتھ اپنے کام کا آغاز کیا تھا لیکن دو ہی سال میں

یعنی ۱۹۷۵ء میں اسے تحلیل کر دیا گیا اور اس کی جگہ ایک مشورتی شورا بنائی گئی اس شورا کے ممبران کی خاص بات یہ ہے کہ انہیں کسی بھی طرح کی قانون سازی کا حق حاصل نہیں ہے (Country report}
(.Bahrain,Quarter 1995.p.3.

۱۹۷۳ء سے لیکر اب تک اس ملک میں کوئی الیکشن نہیں ہوا ہے اس ملک کی باگ ڈور شیخ عیسی بن سلمان بن آل خلیفہ کے ہاتھوں میں ہے جنہیں امیر بحرین کہا جاتا ہے اگر چہ بنیادی دستور العمل میں بحرین میں حکومت کے بنیادی ارکان کو مستقل طور پر اختیار حاصل ہے لیکن الیکشن نہ ہونے کی وجہ سے بحرین کی حکومت موروثی نظام کے تحت قائم ہے امیر کو مطلق اختیارات حاصل ہیں جس کے تحت حکومت نسل در نسل آل خلیفہ کے خاندان میں ہی منتقل ہوتی رہے گی

(بحرین، مباحث کشورھا وساز مانھای بین المللی ص/۱۵۶)

جھنڈا:

بحرین کا جھنڈا سفید اور سرخ رنگوں سے مل کر یوں بنا ہے کہ بائیں طرف سفید رنگ ہے اور داہنی طرف سرخ رنگ ہے۔

(بحرین، مباحث کشورھا وساز مانھای بین المللی ص/۱۵۶)

بین الاقوامی اداروں میں بحرین کی رکنیت:

بحرین مختلف بین الاقوامی اداروں کا رکن ہے جن میں سے کچھ یہ ہیں:

۱۔اقوام متحدہ {u:n}

۲۔ادارہ متحدہ صنعت وٹکنالوجی{unado}

۳۔ادارہ توسیع تجارت اقوام متحدہ{{Unctad

۴۔یونسکو{Unesco}

۵۔اسلامی کانفرنس{Oic}

۶۔غیر وابستہ تحریک{Nam}

۷۔ترقی پذیر ممالک{G-77}

۸۔عالمی ادارہ تجارت{w.t.o}

۹۔عالمی زراعت{Fao}

۱۰۔بین الاقوامی تعمیرات وترقیات کا بینک{Ibrd}

۱۱۔بین الاقوامی ملکی ہوابازی{I.CAO}

۱۲۔کام سے متعلقہ بین الاقوامی تنظیم{ILO}

۱۳۔بین الاقوامی دریائی تنظیم{IMO{

۱۴۔بین الاقوامی حفظان صحت{WHO

۱۵۔ہلال احمر یا ریڈ کراس{LORCS}

۱۶۔پوسٹ کا بین الاقوامی ادارہ{UPU

۱۷۔مزدوروں کا متحدہ فڈریشن{WFTU

۱۸۔بین الاقوامی ادارہ موسمیات{WMO

۱۹۔دریائی سیٹ لائیٹ{ INMARSAT

۲۰۔بین الاقوامی ادارہ برائے مواصلات{INTELSAT

۲۱۔بین الاقوامی پلیس{INTERPOL

۲۲۔بین الاقوامی المپیک{IOC

۲۳۔بین الاقوامی معیارات{ASO

۲۴۔ITU(بحرین،مباحث کشورھاوسازمانھای بین المللی ص/۱۵۶)

بحرین کی سیاسی تنظیمیں:

بحرین میں تقریبا۱۵/سیاسی پارٹیاں ہیں جن میں کچھ پارٹیاں اہلسنت سے متعلق ہیں تو کچھ شیعوں کی پارٹیاں ہیں۔

اہلسنت کی معروف سیاسی جماعتیں:

۱۔ جمعیۃ الاصلاح؛ جسکا تعلق اخوان المسلمین سے ہے

۲۔ العدالۃ الوطنیہ

۲۔الجمعیۃ الاسلامیہ لیبرل طرز فکر رکھنے والی پارٹی جسکی قیادت ''شیخ عبداللطیف المحمود'' کے ہاتھوں میں ہے اور اکثر حکومت کے موقف کی حمایت کرتی ہے۔

۳۔ جمعیۃ التربیۃ الاسلامیہ سلفی نقطہ نظر رکھنے والی پارٹی جو جمہوریت اور شیعوں کے خلاف ہے۔

۴۔ جمعیۃ الاصالۃ الاسلامیہ: سلفی نقطہ نظر رکھنے والی پارٹی جس کو سعودی عرب کی حمایت حاصل ہے۔

شیعوں کی معروف سیاسی تنظیمیں

۱۔ جمعیت وفاق اسلامی

۲۔حرکۃ حق

۳۔حرکۃ البحرین یا تحریک بحرین{BFM}

۴۔الجبۃ الاسلامیۃ لتحریر البحرین{IFLB}

بحرین کی سب سے بڑی اور طاقت ور پارٹی شیعوں کی اسلامی قومی وفاق نامی تنظیم(Fuller,Graham,E, & Rend rahim francke The arab shia;the forgeotten muslims 6;chapter) ہے جس کے بانیوں میں ڈاکٹر سعید شہابی کا نام نمایاں ہے عمل اسلامی پارٹی، اور الرسالہ پارٹیاں بھی بحرین میں سرگرم عمل ہیں لیکن آمریت واستبداد کے گھٹا ٹوپ اندھیروں میں انکی مثال چمکتے ہوئے جگنوؤں سے زیادہ نہیں ہے بحرین میں یوں تو شیعہ اور اہلسنت دونوں ہی کی متعدد سیاسی پارٹیاں نظر آتی ہیں لیکن شیعوں کی زیادہ تر پارٹیاں حکومت کی جانب سے غیر قانونی ہیں۔تحریک بحرین'' {BFM} بحرین کے شیعوں کی ایک بڑی پارٹی ہے بحرین میں اسے ''حرکۃ البحرین'' کے نام سے جانا جاتا ہے، اس کے اکثر رہبران بیرون ملک ہیں۔(Fuller,Graham,E, & Rend rahim francke

The arab shia;the forgeotten muslims

(6;chapter

اس تنظیم کی خصوصیت یہ ہے کہ یہی وہ تحریک ہے جو بین الاقوامی سطح پر بھی پہچانی جاتی ہے اور اس کی اعلی کمان میں پڑھے لکھے لوگ ہیں جو جانتے ہیں کہ اپنے مطالبات کو کس طرح سامنے رکھنا چاہیے لبنان کی مجلس کے سابقہ اسپیکر مرحوم شیخ مہدی شمس الدین سے بھی اس تحریک کے اچھے روابط تھے(Fuller,Graham,E, & Rend

rahim francke

The arab shia;the forgeotten muslims

(6;chapter

منامہ کے شمال میں قدیمی شہر ''محرق'' تحریک بحرین کا گڑھ سمجھا جاتا ہے اس شہر میں آدھی آبادی شیعوں کی ہے اور آدھی اہلسنت کی، تحریک بحرین کی اعلی کمان میں دو طرح کے داخلی اور بیرونی رہبران ہیں داخلی طور پر رہبری کرنے والے سامنے نہیں رہتے ہیں لیکن اس بات کا احتمال ہے کہ شیخ عبدالامیر الجمری سے اس کا تعلق ہو۔شیعوں کی ایک اور بڑی سیاسی پارٹی ''{IFLB}الجبۃ الاسلامیۃ لتحریر البحرین ہے جو ۱۹۸۰ء میں ہادی مدرسی کی قیات میں وجود میں آئی(

Fuller,Graham,E, & Rend rahim francke

The arab shia;the forgeotten muslims

6;chapter)اس کے علاوہ کچھ لیبرل پارٹیاں بھی سرگرم عمل ہیں جیسے جمعیۃ عمل وطنی دیمکراسی اور دیمکراسی تقدمی وغیرہ۔

ّ بحرین کا تعلیمی نظام اور اہم علمی مراکز:

بحرین میں تعلیمی رجحان کی ایک قدیم تاریخ ہے صفوی دور حکومت میں بھی یہاں علمی رونق پائی جاتی تھی ایک زمانہ تھا جب ایران سے لوگ دینی تعلیم حاصل کرنے بحرین جایا کرتے تھے(پیروز مجتھد زادہ، جنبش ھای سیاسی بحرین وابعاد منطقہ ای آن ص ۱۳۷۴/) شروع ہی سے علمی رجحان کی بنا پر یہاں کے لوگ دیگر علاقوں سے زیادہ

پڑھے لکھے ہوا کرتے تھے خلیج فارس کے دیگر علاقوں سے قدیم تعلیمی ماضی کی بنیاد پر آج بھی بحرین میں لٹریسی لیول خلیج کے دیگر ممالک سے بہتر ہے یہاں پر تعلیم مفت ہے اور تعلیمی مراحل میں ضروری تمام اشیاء جیسے کاپی، کتاب، قلم ،سب حکومت کے ذمہ ہے (بحرین، مباحث کشورھاوسازمانھای بین المللی ص ۴۶ر) یہاں کا تعلیمی نظام برٹش اور زبان تعلیم عربی ہے البتہ ہائی اسکول کے بعد انگریزی میں بھی تعلیم دی جاتی ہے۔

بحرین میں تعلیم کے تین بنیادی مراحل ہیں:

۱۔تحتانیہ: (پرائمری) اس میں ۶ سال کی عمر سے بچوں کو تعلیم دی جاتی ہے یہ چھ سال پر محیط مرحلہ ہے جس کو طے کرنے کے بعد بچہ بعد کے مرحلہ میں داخل ہوتا ہے

۲۔وسطانیہ:(ہائی اسکول) اس مرحلہ میں مدت تعلیم تین سال ہے اس مرحلہ کے بعد طالب علم بعد کے مرحلہ یعنی فوقانیہ کے لئے تیار ہوجاتا ہے

۳۔فوقانیہ:(انٹرمیڈیٹ)اس مرحلہ میں آ کر طالب علم کو موضوعات کا انتخاب کرنا ہوتا ہے یہ مرحلہ تین حصوں میں تقسیم ہوجاتا ہے جس حصہ میں طالب علم اپنی تعلیم کو مکمل کرنا چاہے اپنے ذوق اور زندگی کے شرائط کے پیش نظر اسے منتخب کرسکتا ہے یہ مرحلہ تین شعبوں میں تقسیم ہوتا ہے:

۱۔عمومی

۲۔تجارت:

۳۔صنعت وٹکنالوجی

۱۹۹۱ء میں ہونے والے سروے کے مطابق ۱۵سال سے اوپر ۸۴ فیصد لوگ بحرین میں پڑھے لکھے ہیں یہاں ۱۹۰ سے زائد کالج اور علمی مراکز ہیں (۔ {The europa world yer book , 1994.p . 457} ۱۹۹۱ء کی ایک رپورٹ کے مطابق ۱۵.۵۰% حکومت کا بجٹ تعلیم سے مخصوص ہے {The europa world yer book 1994 volume 1,p .457

بحرین کے چند بڑے علمی مراکز یہ ہیں:

خلیج فارس یونیورسٹی: یہ یونیورسٹی ۱۹۸۰ء میں منامہ میں قائم ہوئی اس کی تعمیر کا خرچ خلیج فارس کی سات

حکومتوں من جملہ، کویت، قطر، سعودی عرب، اور متحدہ عرب امارات نے دیا۔ (بحرین، مباحث کشورھاوسازمانھای بین المللی ص/۴۶)

بحرین یونیورسٹی: یہ یونیورسٹی ۱۹۸۶ء میں شہر عیسی میں قائم ہوئی اس یونیورسٹی کے سربراہ بحرین کے وزیر تعلیم ہیں اس کے علاوہ خلیج کالج، طب کالج میڈیکل کالج وغیرہ بحرین کے اہم علمی مراکز ہیں۔

بحرین میں ہندوستانیوں، پاکستانیوں امریکیوں اور ایرانیوں کے بھی الگ الگ اسکول اور علمی مراکز ہیں جو مستقل طور پر تعلیمی خدمت میں مشغول ہیں۔ (بحرین، مباحث کشورھاوسازمانھای بین المللی)

بحرین کے اہم فرہنگی، ثقافتی وتحقیقاتی مراکز:

تعلیمی میدان میں منصوبہ بنداندازمیں آگے بڑھنے کے ساتھ ساتھ بحرین میں فرہنگی، ثقافتی اور تحقیقاتی طور پر بھی کافی گہما گہمی نظر آتی ہے چنانچہ مختلف شعبوں سے متعلق مختلف انجمنیں اور تنظیمیں ہیں جو اپنے اپنے متعلقہ شعبے میں سرگرم عمل ہیں جن میں سے کچھ اہم یہ ہیں:

ادباءاور مصنفین کی تنظیم:

یہ تنظیم ۱۹۶۹ء میں بحرین کے ادب ولٹریچر کو بارور بنانے کی غرض سے تشکیل پائی اس کا کام اپنے اراکین کے نوشتہ جات کو چاپ کرانا اور مختلف موضوعات کے تحت تقاریر وسمیناروں کا انعقاد کرانا ہے

انجمن انگیریزی:

یہ انجمن ۱۹۵۹ء میں منامہ میں انگریزی زبان کی تعلیم وتدریس کی غرض سے تشکیل پائی، اس کا کام برطانیہ کے سلسلہ میں ضروری معلومات فراہم کرنا اور تعلیم وثقافت پر زور دینا ہے:

انجمن اسلامی:

۱۹۷۹ء شہر محرق میں تشکیل پائی اس کا مقصد قرآن، فقہ، حدیث، سنت، کی تعلیم وتدریس اور مختلف موضوعات میں تقاریر وتعلیمی منصوبہ بندی کے ذریعہ قوم کو آگاہ کرنا نیز زکات اور دیگر ہدایا کی تقسیم ہے۔ (بحرین، مباحث کشورھاو سازمانھای بین المللی، ص/۵۰)۔

مرکز تحقیقات بحرین:

یہ مرکز ۱۹۸۱ء شہر منامہ میں مختلف شعبوں میں علمی وتحقیقاتی امور کی انجام دہی خاص کر ٹکنالوجی واقتصاد، نظریاتی مباحث وغیرہ کے سلسلہ میں تاسیس ہوا اس میں عملی ونظریاتی امور کے سلسلہ میں ہونے والے مباحث کے علاوہ انرجی اور قدرتی ذخائر سے استفادہ کے سلسلہ میں تحقیق وگفتگو ہوتی ہے۔

انجمن ماہرین عمرانیات:

۱۹۷۹ منامہ میں تشکیل پائی ماہرین عمرانیات کے تحقیقاتی موضوعات کے سلسلہ میں افکار کے تبادل کے پیش نظر تین موضوعات میں اس انجمن نے اپنے کام کا آغاز کیا:

۱۔نشہ آور اشیاوالکحل کا استعمال

۲۔نابینا افراد کے سلسلہ میں مطالعات وتحقیق

۳۔بحرین کے اجتماعی نشیب وفراز اور گھرانوں کے سلسلہ میں مطالعہ وتحقیق

ان انجمنوں وتنظیموں کے علاوہ، انجمن ہنروفن، وکیلوں کی انجمن، کمپیوٹر کی انجمن، معاصر فن وہنر کی انجمن، آثار قدیمہ سے متعلقہ انجمن، ڈاکٹروں کی انجمن، انجینئروں کی انجمن وغیرہ بھی اپنے اپنے شعبوں میں فعال ہیں، بحرین کے اہم فرہنگی، ثقافتی اور تحقیقاتی مراکز میں احمد الفارسی کتاب خانہ، قومی مرکزی کتاب خانہ، بحرین یونیورسٹی کا کتاب خانہ تاریخی مآخذ کا کتاب خانہ، اور میوزیم وغیرہ بھی شامل ہیں (بحرین، مباحث کشورھا وسازمانھای بین المللی ص ۵۰/۵۱)

بحرین کا موسم، قدرتی ذخائر اور اقتصاد :

جزیرہ کی صورت ہونے کی بنا پر یہاں کی آب وہوا گرم اور مرطوب ہے گرمیوں میں یہاں پر شدید گرمی پڑتی ہے اور سردیوں میں موسم نسبتاً معتدل رہتا ہے یہاں پر صرف دو موسم ہیں موسم گرما اور معتدل موسم۔موسم خزاں سے جیسے جیسے ٹھنڈک کا موسم آتا ہے یہاں پر ہوا میں اسی اعتبار سے خنکی پیدا ہوتی جاتی ہے ۔

بارش یہاں پر بہت کم اور نہ کے برابر ہے جسکا متوسط پیمانہ ۱۳۰ ملی لیٹر ہے ({The Statesmans's year book 1993.94.p180}) بحرین کی زراعت اور کھیتی باڑی کی زمینیں چھوٹے چھوٹے ٹیلوں اور وادیوں میں ہیں بحرین کے شمال کا ساحلی علاقہ اپنی زرخیزی کی مثال آپ ہے اسی لئے اکثر باغات اور فصلیں اس

علاقے میں ہیں جسکا عرض صرف ۵ رکلومیٹر ہی ہے اس مختصر سے حصہ میں مالک نے بحرین کو وہ سب کچھ دیا ہے جسکی وہاں کے باشندوں کو ضرورت ہوسکتی تھی۔ یہ علاقہ شمال سے مشرق تک کھجوروں کے درختوں سے ڈھکا ہوا ہے اور اسی مختصر سے حصہ میں چشموں اور پانی کی قناتوں کی فراوانی کے سبب ہر طرف لہلاتے باغات ہیں جو طرح طرح کے پھل میووں اور سبزیوں سے لدے ہوئے نظر آتے ہیں بحرین کو ۱۰ لاکھ خرموں کے درختوں کی سرزمین کے طور پر بھی جانا جاتا ہے۔ ڈرائی فروٹ، خرمے، بادام، انار، کیلے، انجیر، آم، انگور، اور مختلف سبزیاں سبھی چیزوں کی اس حصہ میں ارزانی نظر آتی ہے۔ (دائرۃ امعارف بزرگ اسلامی، ص ۴۰۰، زیرنگرانی موسوی بجنوردی)

''اس علاقے کے علاوہ زراعت وغیرہ کافی محدود پیمانے پر ہے بحرین کے کل رقبہ میں کھیتی باڑی کی زمین تقریبا ۲۱۵۵، ۱۱ ایکڑ ہے جس میں پھل، سبزیاں وغیرہ ہوتی ہیں (دانشنامہ جہان اسلام حرف ب زیرنظر گرانی غلام علی حداد عادل

بحرین کے مرکزی علاقے کی آب وہوا خشک ہے اور یہاں کی زمینیں بنجر ہیں یا صحرائی گھاسوں سے ڈھکی ہوئی ہیں۔ بحرین کا سب سے اونچا علاقہ'' جبل الدخان'' ہے جو ۱۳۵ میٹر آزاد پانی سے اونچائی پر واقع ہے۔ موتیوں کی تجارت، میٹھے پانی کے چشموں، کھیتی باڑی کے لئے زرخیز زمین زراعت، باغبانی اور المونیم کی پیداوار کی بنیاد پر بحرین کو ایک ثروت مند جزیرہ کے طور پر جانا جاتا ہے ۱۹۳۲ء میں تیل کی دریافت کے بعد سے بحرین تیل اور موتیوں کے لئے شہرت رکھتا ہے بحرین کی فی کس آمدنی، ۴۰۰، ۴۰ امریکی ڈالر ہے اور تیل کی یومیہ پیداوار ۵۶۰، ۴۸ ملین بیرل ہے، مشرق وسطی میں سب سے زیادہ المونیم بحرین میں ہوتا ہے اور دنیا میں المونیم پیدا کرنے والے ممالک میں بحرین پانچویں نمبر کا ملک جانا جاتا ہے مغربی ایشیا کی اقتصادی تنظیم کی رپورٹ کے مطابق ۲۰۰۶ء میں بحرین مغربی ایشیا کے ممالک میں اقتصادی اعتبار سے سب سے زیادہ اقتصادی ترقی کرنے والے ملک کے طور پر ابھر کر سامنے آیا تھا

تیل، گیس، المونیم اور دیگر معدنیات کے علاوہ بحرین میں ایک بڑی آئل رفائنز بھی ہے (مجموعہ مقالات خلیج فارس، مقالہ سرزمین بحرین، ص ۸۶، مرتضی اسعدی، جہان اسلام، ذیل بحرین، ؛ علی محمدی، بحرین جزیرہ ایمان، ص ۱۹، جغرافیای جہان اسلام، ص ۲۲۶/)

اس کے علاوہ یہاں بڑے بڑے شپ بریکنگ یارڈ اور بڑی بڑی کشتیوں کی تعمیر کے کارخانے بھی ہیں اور ایسی بندر گاہیں بھی ہیں جہاں پانچ ہزار ٹن تک کی کشتیاں لنگر ڈال سکتی ہیں (دانشنامہ جہان اسلام زیر نظر دکتر حداد عادل/ ص۳۳۲/ حرف ب ذیل بحرین)

یہاں کئی ایک غیر ملکی اور ملٹی نیشنل کمپنیوں کے ہیڈ کوارٹرز بھی ہیں اور یہاں امریکہ کا پانچواں بحری بیڑہ بھی ہے۔بحرین عرب لیگ اور خلیجی تعاون کونسل {Gcc} کا ایک اہم ملک ہے، بحرین میں شرح خواندگی ۔۹۰/۸ ہے G.D.P ۲۸/۲۷۵، اور p.p.p ۲۷/۲۱۴ ہے۔

بیرونی سرمایہ کاری کے لئے اقتصادی اور سیاسی اعتبار سے بحرین ایک بہترین جگہ ہے اس لئے کہ یہاں سرمایہ اور پیسہ کے ورود وخروج پر زیادہ سختی نہیں ہے بلکہ سرمایہ کاری کے لئے یہاں کافی سہولیات بھی فراھم ہیں کسٹم اور ٹیکس سے متعلقہ قوانین بہت آسان اور سادے ہیں جن کی بنیاد پر یہاں اقتصادی امور کی انجام دہی مشکل نہیں ہے۔ اقتصادی نقطہ نظر سے یہاں کا اقتصاد مغربی اقتصادی اصولوں کا تابع ہے اور اسے آزاد اقتصاد کے طور پر جانا جاتا ہے (بحرین، مباحث کشورھا وسازمانھای بین المللی ص/۷۸)

خلیج فارس کے ثروت مند ممالک کی بندرگاہوں سے بحرین آنے جانے والے جہازوں کی آزادانہ آمدورفت بحرین کے اقتصادی اور سیاسی امتیازات میں ایک ایسا امتیاز ہے جس سے حکومت بحرین کو بغیر کچھ کیے ہی اچھا خاصا فائدہ پہنچ جاتا ہے بحرین میں تیل اور المونیم کی وجہ سے بیرونی سرمایہ کاری کے بازار میں بھی خوب رونق نظر آتی ہے۔سمندر سے نکلنے والی قیمتی اشیاء اور انواع واقسام کی مچھلیاں بحرین کے اقتصاد کے اہم ذرائع میں شمار ہوتی ہیں بحرین میں شکار کی جانے والی مچھلیاں جاپان اور امریکہ کے بازاروں میں ایکسپورٹ کی جاتی ہیں بحرین کے قدرتی ذخائر کے سلسلہ میں بعض دانشور یہ خیال کرتے ہیں کہ'' دنیا میں دریا کے اہم ذخائر و مادی منافع بحرین اور اس کے اطراف کے علاقوں میں پائے جاتے ہیں (بحرین، مباحث کشورھا وسازمانھای بین المللی ص/۷۸) بحرین کے معادن میں سرخ مٹی کو بھی خاص اہمیت حاصل ہے۔

بحرین کی درآمد کا خاصا حصہ اس کا تجارتی جائے وقوع ہے، کہا جاتا ہے کہ بحرین کی درآمدات کا ایک چوتھائی حصہ تجارت کے اوپر منحصر ہے۔آزاد تجارتی منڈی ہونے کی بنا پر بحرین کو خلیج فارس کی تجارت کے مرکز کے طور پر جانا جاتا

ہے۔

اقتصادی نقطہ نظر سے کلی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ بحرین کے اقتصاد کے دو رکن ہیں ایک تیل دوسرا تجارت ہے۔

بحرین کے اقتصاد میں وہاں کے المونیم کے کارخانے کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا جو مشرقی وسطی کا سب سے بڑا المونیم کا کارخانہ ہے یہ کارخانہ برطانیہ، امریکہ اور جرمنی نے مشترکہ طور پر وہاں قائم کیا ہے المونیم کے کارخانے کے علاوہ ۱۹۷۱ء میں قائم شدہ آٹے کا کارخانہ بھی ایک بڑا کارخانہ ہے جس کے ذریعہ بحرین امارات حتی اطراف کے دیگر ممالک میں بھی آٹے کی سپلائی ہوتی ہے البتہ بحرین کے اقتصاد میں زیادہ تر بیرونی عوامل کارفرما ہیں اور بحرینی حکومت اس کوشش میں لگی رہتی ہے کہ جس قدر بھی ہو سکے بیرونی سرمایہ کاروں کو سرمایہ کاری کی سہولت فراہم کی جائے چنانچہ گزشتہ چند سالوں میں بیرونی سرمایہ کاروں کو بحرین میں سرمایہ کاری کی ترغیب کے سلسلہ میں قائم ہونے والی کمیٹی کی جانب سے منتشر رپورٹ سے پتہ چلتا ہے کہ ۹۱-۱۹۸۹ تک بیرونی کمپنیوں نے بحرین میں سرمایہ کاری کے لئے اپنے نام درج کروائے تھے اور یہ تعداد ۱۹۹۴ میں ۲۰۰ کمپنیوں تک پہنچ چکی تھی۔ (بحرین، مباحث کشورھا و سازمانھای بین المللی ص ۸/۷)

حکومت بحرین اس کوشش میں ہے کہ بحرین کو ایک بین الاقوامی مالی مرکز کی شکل میں ڈھالا جاسکے چنانچہ یہاں بینکاری نظام میں کافی بہتری آئی ہے بیرونی ممالک کے بینکوں کو بحرین میں کام کرنے کی اجازت ملنے کے بعد سے بحرین خلیج فارس میں بینک کے سب سے بڑے مرکز کے طور پر ابھر کر سامنے آیا ہے

خلیج فارس کے قلب میں واقع ہونے کی وجہ سے بینکی نظام کے لئے بحرین ایک بہت مناسب جگہ ہے اسی وجہ سے بحرین کے داخلی بینکوں کے علاوہ بیرونی بینکوں میں بھی آپسی رقابت چل رہی ہے جسکا سیدھا فائدہ حکومت کو ہو رہا ہے

بحرین میں قائم بیرونی بینک کی برانچوں کا اجمالی تعارف:

۱۔ ۱۹۷۷ء منامہ میں تاسیس ہونے والا الاھلی بینک {Al-ahli Commercial bank} جس کی ۱۹۹۴ میں کل پونجی ۲۰۵/۶ ملین بحرینی دینار تھی اور ۱۹۹۳ میں اسکا منافع ۱۳/۶۴ امریکی ڈالر تھا یہ بینک سو فیصد خصوصی ہے اور اس کے ۷/شعبے ہیں

۲۔اسلامی سرمایہ کاری کا البارکہ بینک منامہ{AL-Baraka islamic investment ban}

۳۔ارلا بینک{Arlabank international}

۴۔مشرق وسطی بینک{ Bahrain Middle east bank }

۵۔سعودی عرب۔بحرین بینک{B.S.B BANK}

۶۔بحرین۔کویت بینک B.B.K }

۷۔فیصل اسلامی بینک{Faisal islamic bank of Bahrain }

۸۔بین الاقوامی خلیج فارس بینک{ G.I.B. Gulf international bank}

۹۔قومی بینک{N.B.B National bank of bahrain}

بحرین کے اپنے اور سعودی عرب وکویت کے ساتھ قائم مشترکہ بینکوں کے علاوہ بھی یہاں پر مختلف بیرونی بینک قائم ہیں جن میں سے کچھ معروف یہ ہیں:

آرمو بینک{ABN ARMO bank}(ہالینڈ)

عربی بینک {ARABbank }(اردن)

بانک ملی ایران The national bank of islamic ripublic of Iran(اسلامی جمہوریہ ایران)

صادرات بینکSaderat bank of islamic ripublic of IRAN (اسلامی جمہوریہ ایران)

قاہرہ بینک} (مصر)

پیرس بینک (فرانس)

برٹش مشرق وسطی بینک{ Birtish bank of the Middle est} (برطانیا)

سٹی بینک{Citibank}(امریکہ)

حبیب بینک{ Habib bank}(پاکستان)

کویت بینک}(کویت)

رافدین بینک {Rafidain bank}(عراق)

سعودی بینک{ Saudi national commercial bank} (سعودی عرب)

یونائیٹڈ بینک{ United bank}(برطانیہ)

ان بینکوں کے علاوہ اور بھی دیگر بینک بحرین میں مشغول ہیں جو زیادہ تر برطانیہ، امریکہ، فرانس، کینیڈا، جنوبی کوریا، ملیشیا، ہانک کانگ، اور انڈونشیا سے متعلق ہیں۔(بحرین، مباحث کشورھاوسازمانھای بین المللی ص۱۱۰/۱۱۱)

ان بینکوں کے علاوہ دیگر اور بھی کریڈٹ ادارے بحرین میں فعال ہیں جو اس بات کا ثبوت ہیں کہ اقتصادی سرمایہ کاری کے لئے بحرین ایک بہترین جگہ ہے اور اگر مناسب قوانین کی روشنی میں حکومت بحرین، بحرین میں ہونے والی سرمایہ کاری سے فائدہ اٹھانا چاہے تو بحرینی عوام کے لئے بہت کچھ کیا جا سکتا ہے

اس کے علاوہ اقتصادی اعتبار سے محرق{Moharraq}، سترہ{Setra}، ام نعسان{Ommenacsan} بحرین کے اہم جزایر ہیں جو موتیوں کی پیداوار کی بنا پر ساری دنیا میں معروف ہیں۔ بحرین اسلام سے قبل و بعد قریب ساتویں صدی تک پورے خلیج فارس کی ساحلی سرزمین کو بصرہ سے عمان تک شامل تھا(جغرافیای تاریخی کشورھائے اسلامی دکتر حسین قرچانلو،ص۲۳۱/۲۴۰)

بحرین عہد قدیم سے ظہور اسلام تک :

بحرین خلیج فارس کے دیگر شہروں کی طرح نہیں ہے جن کا وجود تیل کا مرہون منت ہے، بلکہ حقیقت میں بحرین مشرق وسطا میں عہد قدیم کے تمدن کا گہوارہ رہا ہے جو عیسوی صدی سے قبل دوسرے ہزارے میں دریائے سندھ کے قدیم تمدن{Mohenjodaro}.اور{Harappa}. کے ہم عصر رہا ہے

(جغرافیای تاریخی کشورھائے اسلامی دکتر حسین قرچانلو،ص۲۳۱/۲۴۰،

Fuller,Graham,E, & Rend rahim francke The arab muslims; shia;the forgeotten

(chapter 6

بیان کیا جاتا ہے کہ {Henry rawlinson} نے اسی جگہ پیکانی خط{.Cuneiformscript} میں تحریر

شدہ کتبہ دریافت کیا جس میں دیلم {Dilmun } جزیرہ کا نام کندہ تھا ۔(دانشنامہ جہان اسلام ، ص ۳۳۲/حرف ر/ب، زیرنگرانی، غلام علی حداد عادل)

{Henry rawlinson} کے بقول دیلم درحقیقت بحرین ہی کو کہا جاتا تھا، ڈینمارک کے ماہرین آثار قدیمہ بحرین سے ملنے والے آثار کو عصر حجر تک بیان کرتے ہیں (دانشنامہ جہان اسلام زیرنظر دکتر حداد عادل/ ص۳۳۲/) ماہرین آثار قدیمہ کی تحقیقات سے ظاہر ہوتا ہے کہ بحرین میں پانچ ہزار سالہ پرانا تمدن رہا ہے (دانشنامہ جہان اسلام زیرنظر دکتر حداد عادل/ص۳۳۲/)

بعض ماہرین قدیمہ کے مکشوفہ آثار بحرین میں ۵/ ہزار سال سے بھی زیادہ کے انسانی ماضی کی نشاندہی کرتے ہیں۔ بعض دینی اور نیم تاریخی روایتوں سے پتہ چلتا ہے کہ بحرین ارم بن سام بن نوح کی اولاد کا مسکن رہا ہے لیکن بحرین کی رسمی اور شناختہ شدہ تاریخ ہخامنشی دور سے آگے نہیں بڑھتی ہے۔طبری کے ایک بیان سے واضح ہوتا ہے کہ ہخامنشیوں کے سقوط کے بعد عرب قبائل ملوک الطّوائف (سلوکی۔اشکانی) کے دور میں بحرین میں اکھٹا ہوئے اور انہوں نے ایک متحدہ محاذ قائم کیا اور پھر عراق کی طرف روانہ ہوگئے، اس کے بعد بحرین کے سلسلہ میں زیادہ تر معلومات اردشیر بابکان کے دور حکومت کی طرف پلٹتی ہیں جس کے فتوحات کے سلسلہ میں بحرین کو ایران کے ایک صوبہ کے طور پر بیان کیا گیا ہے اردشیر کے بارے میں ملتا ہے کہ اس نے بحرین کے اس وقت کے حاکم کو شکست دے دی اور بحرین پر قبضہ کرلیا۔(دانشنامہ جہان اسلام زیرنظر دکتر حداد عادل/ص۳۳۲، محمد بن جریر طبری، تاریخ طبری، ۱/۶۰۹)

اسلام سے قبل بحرین کے باشندوں کا دین:

ماہرین آثار قدیمہ نے کھدائی کے ذریعہ بحرین میں جو انسانی ماضی کا پتہ لگایا ہے اس کے بموجب تین ہزار سے پانچ ہزار سال پہلے تک وہاں پر مختلف قوموں نے زندگی گزاری ہے۔اگرچہ بحرین میں زندگی گزارنے والی اقوام کی دقیق اور صحیح اطلاعات ہمارے پاس نہیں ہیں لیکن وہاں پر ملنے والے مٹی اور ٹھیکرے کے برتنوں، پرانی تزئینی اشیاء اور سانپ کے بقایا ڈھانچوں سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ ایک طرح کا ایسا دین بحرین میں رہا ہوگا جس میں یا تو لوگ سانپ کی پرستش کرتے ہوں گے یا ان کے نزدک سانپوں کی خاص اہمیت ہوگی اور ممکن ہے کہ سانپ

اس دور کی زرخیری کی ایک علامت ہوں، سومریوں سے مشابہ ایک کاہن کے مجسمہ کا کشف ہونا اور سومریوں کے معابد کی طرح کی قربان گاہوں کا ملنا نیز دریائے سندھ کے علاقہ کے مثل چھوٹے چھوٹے غسل خانوں اور حوضوں کا سامنے آنا ماہرین آثار قدیمہ کو اس بات سے قریب کرتا ہے کہ بحرین کے باشندوں کے درمیان ایک ایسا تمدن رہا ہوگا جو بین النہرین اور سندھ کے تمدن سے متاثر ہوگا۔

قرائن وشواہد کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ غالبا اس ملک کے قبائل بت پرست رہے ہوں گے، چنانچہ اسی بات کی دلیل کے طور پر بکر بن وائل قبیلہ کے بت اوال کا نام لیا گیا ہے جس کی نگہبانی وحفاظت کی ذمہ داری بنی عامر کے قبیلہ کی تھی (ابن حزم، علی، جمھرۃ انساب العرب ۱،ص۴۹۳، بیروت، یاقوت حموی، ۱، ۳۹۵)

البتہ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ انہیں قبائل میں سے کچھ لوگ جیسے بنی تمیم سورج کی پرستش کیا کرتے تھے (دائرۃ المعارف بزرگ اسلامی، کاظم موسوی، بجنوردی ص۴۱۴/)

اسلام سے قبل یہاں کے مقامی ادیان میں زرتشت، عیسائیت، اور یہودیت کو پیش کیا جا سکتا ہے، ان ادیان میں زرتشتی دین جسے منابع میں مجوسیت سے بھی جانا جاتا ہے بحرین کے جنوبی ساحل کے علاقوں میں پایا جاتا تھا اور بنی تمیم اس کے پیرو تھے (ابن حزم، جمھرۃ انساب العرب ۱/۴۹۱، ابن اثیر ،الکامل فی التاریخ ۱/۵۸۷) قبیلہ بنی تمیم کا ایک گروہ جسے ''اسبذی'' کہا جاتا ہے جو بحرین کے ہجر شہر میں سکونت پذیر تھا اس کے سلسلہ میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ملاقات کا تذکرہ بھی منابع میں نظر آتا ہے (سجستانی، سلیمان، سنن ابوداؤد، ۳/۱۶۸ بیہقی احمد، السنن الکبری، حیدرآباد دکن،، ۹/۱۹۰) تاریخ میں ملتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں ہجر کا حاکم بھی جسے حضور نے اسلام کی دعوت دی تھی اسبذیوں میں سے تھا (یاقوت حموی، معجم البلدان ،۱، ۲۳۷)

زردشت کے علاوہ عبدالقیس اور بکر بن وائل کے قبیلوں سے تعلق رکھنے والے کچھ لوگ عیسائیت کو بھی اپنے دین کے طور پر مانتے تھے اور عیسائیت کے پیرو تھے (تاریخ یعقوبی، ۱/۲۹۸) اور ان کے ہجر، دارین، وسابج میں بڑے بڑے کلیسا تھے (دائرۃ المعارف بزرگ اسلامی، کاظم موسوی بجنوردی، ص۴۱۴/)

اس علاقے میں عیسائیت کا رواج بظاہر عیسائی مبلغین کی جدوجہد کا نتیجہ ہے جو عراق اور حیرہ سے تاجروں کے قافلوں کے ساتھ آتے تھے اور عیسائیت کی تبلیغ کرتے تھے ظہور اسلام کے وقت بحرین کی بڑی عیسائی شخصیت کے طور پر

جارود بن بشر ابن معلیٰ کا نام منابع میں ذکر کیا گیا ہے یہ وہی شخص ہے جو عبدالقیس کے نمائندہ کے طور پر مدینہ گیا اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے گفتگو کے بعد ایمان قبول کر لیا، البتہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد جارود کا قبیلہ اپنے سابقہ دین پر پلٹ گیا جبکہ جارود اپنے ایمان پر قائم رہے اور اپنے قبیلہ کے لوگوں کو مرتد ہونے سے روکتے رہے (ابن ہشام، سیرہ ابن ہشام جلد۲/ص۲۹۸)

زرتشتیوں اور عیسائیوں کی طرح دین یہود کے پیروکار بھی ظہور اسلام سے قبل اور بعد بحرین میں نظر آتے ہیں لیکن انکی آمد اور وہاں بسنے کے سلسلہ میں تفصیل سے کچھ نہیں کہا جا سکتا ہے لیکن مختلف دلائل کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ یہودیوں کے دین میں تبلیغ نہ ہونے کی وجہ سے ان کی تعداد میں چنداں اضافہ نہ ہوا ہوگا (دائرۃ المعارف بزرگ اسلامی حرف ب/ذیل بحرین ،ص۴۱۴/)

بحرین میں اسلام کی آمد:

بحرین میں اسلام کی آمد کے سلسلہ میں مختلف نظریات پائے جاتے ہیں کچھ لوگوں کا ماننا ہے کہ بحرین میں اسلام خلیفہ اول کے دور میں آیا کچھ خلیفہ دوم کے فتح ایران سے اسے جوڑتے ہیں لیکن قدیم منابع کی طرف رجوع کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ بحرین میں اسلام خود حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں ہی پہنچ چکا تھا چنانچہ معروف مورخ ''بلاذری'' اپنی مایہ ناز کتاب ''فتوح البلدان'' میں لکھتے ہیں:

''حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہجرت کے آٹھویں سال علا بن عبداللہ بن عماد حضرمی کو بحرین کے مجوسی حاکم منذر بن ساوی عبدی کے نام خط دے کر بھیجا جس میں اسے اسلام کی طرف دعوت دی گئی تھی۔ خط ملنے کے بعد بحرین کا حاکم اور بحرین کی سرحدوں کا محافظ سی بخت دونوں ہی اسلام لے آئے ان دونوں شخصیتوں کے ایمان لانے کی بنا پر بحرین کے اطراف کے تمام اعراب نے اسلام قبول کر لیا اور خود بحرین میں رہنے والے ان مجوسیوں، یہودیوں اور نصاری سے علا بن عبداللہ بن عماد نے صلح کر لی جنہوں نے اسلام تو نہیں قبول کیا تھا لیکن جزیہ دینے پر راضی ہو گئے تھے۔'' (بلاذری ،فتوح البلدان ص۱۱۳/)

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد خلیفہ دوم نے رسولؐ کی طرف سے بھیجے گئے نمائندے علاء بن حضرمی کو بحرین سے طلب کیا اور انہیں معزول کر کے عثمان بن ابی العاص ثقفی کو بحرین کا نیا حاکم بنا دیا

(بلاذری ،فتوح البلدان ص۱۱۳/) بحرین کے اسلامی ماضی کے لئے اتنا کافی ہے کہ بحرین ہی وہ مقام ہے کہ جہاں مدینہ کے بعد پہلی نماز جمعہ قائم ہوئی (غلام رضا گلی زوارہ، جغرافیای جہان اسلام، آشنائی با کشورھای اسلامی وقلمرواقلیتھای مسلمان ،ص۲۲۴/)؛

چوتھی صدی تک بحرین کے سلسلہ میں اہم معلومات نظر نہیں آتی ہیں، بظاہر احساء اور قطیف کے لوگوں کے اسلام لانے کے ساتھ ہی بحرین کے باشندے بھی مسلمان ہو گئے تھے (دائرۃ المعارف بزرگ اسلامی کاظم موسوی بجنوردی ،ذیل بحرین)

بحرین ظہور اسلام سے خوارج کی حکومت تک:

بحرین ظہور اسلام کے وقت خسرو وانوشیروان کے دور میں سرزمین فارس کے ایک حصہ کے طور پر ایران کے زیر نظر حکومت آل منذر کے ایک ٹکڑے کے طور پر جانا جاتا تھا، اور بہت سے عرب قبائل خاص کر ''بنی عبدالقیس ''، ''بکر بن وائل''، ''تمیم'' ''وازذ'' سالہا سال پہلے اس علاقے میں ہجرت کر کے آئے اور آباد ہو گئے تھے یہ سبھی'' آل منذر'' کی حکومت کے زیر سایہ زندگی بسر کر رہے تھے (دائرۃ المعارف بزرگ اسلامی جلد۱۱ص۴۰۲/ زیر نظر کاظم موسوی، بجنوردی، حرف ب ذیل بحرین)

یہاں تک کہ خسرو پرویز کے عہد میں بظاہر ساتویں صدی عیسوی کے آغاز میں آل منذر کی جانب سے معین حکومت کے اضمحلال، اور ساسانیوں کے زوال نیز اسلام کے ظہور کی بنیاد پر بحرین کے حالات دگرگوں ہو گئے اور بحرین قبائلی رسہ کشی اور آپسی چھٹ پٹ جھڑپوں سے جو جھتا رہا خاص کر قبیلہ بکر بن وائل اور عبدالقیس اعراب کے درمیان دشمنی کی بنیاد پر ان دونوں میں جنگیں ہوئیں یہاں تک کے خلیفہ اول نے علاء بن حضرمی کو بحرین میں ہونے والی شورش کو ٹھنڈا کرنے کے لئے روانہ کیا جھوں نے کافی جدوجہد کے بعد وہاں کے حالات پر قابو پالیا۔(دائرۃ المعارف بزرگ اسلامی جلد۱۱ص۴۰۲/ زیر نظر کاظم موسوی، بجنوردی، حرف ب ذیل بحرین)

بحرین ابتدائی خلفا کے دور میں اداراتی اعتبار سے مدینہ کا تابع تھا اور بحرین کے والی'' مرکز خلافت'' سے مستقل طور پر بحرین کی طرف روانہ ہوتے تھے۔ (محمد بن جریر طبری، تاریخ طبری جلد۴/ص۹۴) خلیفہ دوم کی خلافت کے آخری ایام اور جناب عثمان وحضرت امیر المومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام کی خلافت کے دوران

بحرین کی ولایت کوایک بڑے علاقے جیسے فارس، یمن، یمامہ یا عمان کے ساتھ ضمیمہ کر کے والی کے حوالے کیا جاتا تھا)(طبری۔جلد۴ص۱۷۶/)

خلیفہ دوم کے دوران خلافت جب اسلامی فتوحات کا سلسلہ شروع ہوا تو سرزمین فارس پر اسلامی فوجوں کے حملہ کے دوران اہل بحرین بھی شریک تھے، بصرہ کی تاسیس کے ساتھ ہی جو اس وقت ایک فوجی چھاؤنی کی حیثیت سے تعمیر ہوا تھا بحرین کے عبدالقیس جیسے بہت سارے قبائل بصرہ کی طرف ہجرت کر گئے۔

بحرین کے قبائل کی بصرہ کی طرف ہجرت، بصرہ اور بحرین کے باشندوں کے درمیان آپسی تعلقات کا باعث بننے کے ساتھ ساتھ بعد میں بھی مختلف حوادث میں موثر رہی، لہذا بصرہ اور بحرین کے درمیان قائم ہونے والے تعلقات میں ان دونوں مقامات کی تاریخ پر نظر ضروری ہے۔ بحرین کی جغرافیائی حیثیت کی بنیاد پر ہمیشہ ہی بحرین اورس کے اطراف واکناف کے علاقوں میں زیادہ تر اقتصادی بنیادوں پر ایک رسہ کشی رہی جس سے علاقے میں بحرین کی اہمیت کا پتہ چلتا ہے بحرین کی ثروت اور دولت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ''یعقوبی کے نقل کے مطابق ابو ہریرہ نے ۱۵سو ہزار (۱۵لاکھ) درھم جمع کر کے دارالخلافہ روانہ کیے (یعقوبی جلد۲،ص۱۵۳/،) تھے بلاذری نے اس رقم کو سات سو ہزار (سات لاکھ) تک بیان کیا ہے (بلاذری،فتوح البلدان ۴۳۵/)اس زمانے میں یہ مال اس قدر زیادہ سمجھا جاتا تھا کہ خلیفہ وقت کو پہلے تو یقین نہ آیا لیکن بعد میں پھر حساب کتاب کا الگ دفتر معین کیا گیا جس میں بحرین سے ملنے والے خراج کا اندراج ہو سکے۔ (دانشنامہ جہان اسلام، زیرنظر غلام علی حداد عادل،حرف ب/بحرین ص۳۳۸/)

اسی اہمیت کے پیش نظر جب امیر شام نے زیاد کو عراق کا حاکم بنایا تو بحرین اور عمان کو بھی شامل کیا لیکن یزید بن معاویہ کے بعد خوارج کی شورش کے بعد بحرین کو عراق کی قلمرو سے الگ کرنے کے آثار نظر آنے لگے اور ابن زبیر کے خوارج سے الگ ہو جانے کے بعد ان کے درمیان جب ایک بڑا شگاف پیدا ہو گیا تو بکر بن وائل اور بنی حنیفہ سے تعلق رکھنے والے کچھ لوگ یمامہ کی طرف آ گئے اور (بلاذری فتوح البلدان ،۱۷۵/۷)انھوں نے کوشش کی کہ بحرین کو اپنے قبضہ میں لے لیں لیکن فوجی چڑھائی میں انہیں ناکامی کا منھ دیکھنا پڑا لیکن آخر کار بعد نجدۃ بن عامر حنفی کی سربراہی میں، خوارج بنی عبدالقیس کو شکست دینے میں کامیاب ہو گئے اور انہوں نے بحرین کو اپنی

حکومت میں شامل کرلیا، عبداللہ بن زبیر نے لاکھ جتن کیے لیکن بحرین پر کوئی کامیابی نصیب نہ ہوسکی عبداللہ بن زبیر کا بحرین کو دوبارہ فتح کرنے کا خواب تو شرمندہ تعبیر نہ ہوسکا لیکن نجدۃ بن عامر کے پرستاروں میں اختلاف ہوگیا اور آپسی پھوٹ کے نتیجہ میں بیان کیا جاتا ہے کہ: بنی قیس بن ثعلبہ سے تعلق رکھنے والے ایک شخص نے جس کا نام ''ابو فدیک'' تھا آپسی اختلافات کو خوب خوب ہوادی اور اور خود مسند حکومت پر براجمان ہوگیا (یعقوبی جلد۲ص/۳۲۶)

نجدہ بن عامر کے قتل کے بعد ابوفدیک کو دیگر خوارج کی شدید نکتہ چینی کا سامنا کرنا پڑا یہاں تک کہ ابو فدیک پر جان لیوا حملہ بھی ہوا لیکن وہ اس سے بچ نکلا (بلاذری، فتوح البلدان، ۱۸۵/۷))۵۱) اور۷۲ ہجری مطابق ۶۹۱ء میں یمامہ سے بحرین آیا اور اس نے ''جواثا'' کو اپنا دارالسلطنت قرار دیا اس بار مصعب بن زبیر اور عبداللہ قسری کی فوجوں نے ایک بار پھر بحرین کو فتح کرنے کی ناکام کوشش کی لیکن ابوفدیک کے آگے گھٹنے ٹیک دیئے (یعقوبی جلد۲/ص ۳۲۵)

انجام کار عبدالملک بن مروان نے نے عمر بن عبیداللہ کی سربراہی میں جواثا کی سمت اپنی افواج کو روانہ کیا جنہوں نے اس بار ابوفدیک کو مات دے دی اور ابوفدیک اس جنگ میں مارا گیا۔(یعقوبی جلد۲ص ۲۳۶) بلاذری جلد/۷ص/۴۴۷) یوں بحرین ایک بار پھر عراق کی حکومت کا حصہ بن گیا۔اس بار بحرین عراق کے خوں خوار حاکم حجاج بن یوسف کے تحت قرار پایا اس دوران بحرین کے لوگ وقفہ وقفہ سے مزاحمت کرتے رہے جنہیں حکومت کی جانب سے ہر بار سختی سے کچل دیا گیا، ۷۸ ہجری میں عبدالقیس کے قبیلہ بنی محارب کی شورش ،۷۹ اور ۸۰ ہجری کے درمیان ریان نکری کی شورش، ۸۰ ہی میں داؤد بن محرز کی شورش یہ تمام شورشیں ہوئیں لیکن سب کو دبا دیا گیا۔ البتہ ان شورشوں میں بنی عبدالقیس کے ''مسعود بن ابی زینب محاربی'' کی شورش حکومت سے لاکھ کوششوں کے باوجود نہ دب سکی جس کے نتیجہ میں بحرین اور یمامہ میں کافی دن تک جنگ کے شعلے بھڑکتے رہے اور اسی شورش کے درمیان بحرین کا ''اشعث بن عبداللہ جارود'' نامی والی وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا لیکن مسعود بن ابی زینب محاربی کی موت کے بعد اس کے ماننے والوں میں اختلاف ہوگیا اور کچھ نے اس کے بھائی سعید کا دامن تھاما تو کچھ نے بنی حنیفہ کے عون بن بشیر کا سعید نے اپنا مرکز ہجر کو بنایا اور عون نے قطیف کو اپنا مرکز قرار دیا (بلاذری فتوح البلدان، ۴۳/۸)

مسعود کی شورش کے علاوہ عبدالملک بن مروان کی خلافت میں بحرین کے بعض باشندوں اور بصرہ کے

مضافات میں رہنے والے بعض قبائل نے حکومت کے خلاف سر ضرور اٹھایا لیکن کسی کو بھی کامیابی نصیب نہ ہوسکی (بلاذری، فتوح البلدان جلد ۸ ص ۱۲۰)

ان تمام نشیب وفراز کے باوجود بحرین عراق کی قلمرو کا ہی ایک حصہ مانا جاتا رہا۔ اموی حکومت کے سقوط کے بعد عباسیوں کے دور حکومت میں بھی بحرین میں کوئی خاص تبدیلی رونما نہ ہوئی اور پہلے ہی کی طرح بصرہ کے والیوں کو ہی بحرین کی امارت بھی سونپی جاتی رہی۔ (تاریخ طبری، جلد ۷ ص ۴۵۹)

خوارج کی پے در پے شورشیں ناکام ضرور ہوئیں لیکن ان کی وجہ سے لوگوں کے درمیان خوارج کے عقائد وافکار کے سلسلہ میں جستجو شروع ہوگئی کہ یہ کون لوگ ہیں ان کا طرز فکر کیا ہے اور یہ کیا چاہتے ہیں۔ اس طرح خوارج دھیرے دھیرے اپنے مخصوص افکار کی بنیاد پر اطراف واکناف میں پہچانے جانے لگے۔ خوارج کے افکار اس وجہ سے بھی بحرین اور اس کے مضافات میں زیادہ پھیلنے میں کامیاب ہوئے کہ بحرین کے جوار میں عمان جیسا ملک اباضیہ خوارج کے گڑھ کی شکل میں تبدیل ہو چکا تھا۔ خوارج کے افکار سے متاثر ہوکر بحرین میں صاحب الزنج کا قیام کافی معروف ہوا، جس کے بارے میں ملتا ہے کہ وہ سامرہ سے بحرین آیا اور پہلے تو یہ دعوی کیا کہ وہ جناب ابوالفضل العباسؑ کی نسل سے ہے اور اسی بنیاد پر ہجر کے خاصے باشندے اس کے ساتھ ہو گئے اور کچھ مخالف ہو گئے پھر موافقین ومخالفین کے درمیان جنگ چھڑ گئی۔ جس کی بنا پر صاحب الزنج نے احسا کی طرف کوچ کرنا زیادہ مناسب سمجھا۔ (ذہبی، سیر اعلام النبلا جلد ۱۳/۱۳۲)

صاحب الزنج کو جناب ابوالفضل العباسؑ کی نسل سے ہونے کے دعوے کی بنیاد پر لوگوں میں اس قدر محبوبیت حاصل ہوئی کہ بعض لوگ صاحب الزنج کے اتنے گرویدہ ہوگئے کہ اسے خراج تک دینے لگے۔ (تاریخ طبری، جلد ۹، ۴۱۱) اگرچہ صاحب الزنج نے اپنے اہداف تک رسائی حاصل کرنے کے لئے اپنے آقاؤں سے تنگ آجانے والے غلاموں اور دیگر طبقوں سے متعلقہ افراد کو اپنے اردگرد اکٹھا کر رکھا تھا لیکن یحیی بن محمد ازرق، محمد بن احسا اور سلیمان ابن جامع وغیرہ جیسے اس کے اہم ساتھی بحرین سے ہی تعلق رکھتے تھے۔ (تاریخ طبری، جلد ۹ ص ۴۱۱)

صاحب الزنج کا قیام مخصوص عقائد، اور غلاموں کی حمایت کی وجہ سے بصرہ اور خوزستان تک پھیلتا چلا گیا

اور جتنی تیزی کے ساتھ پھیلا اتنی ہی تیزی کے ساتھ صاحب الزنج کے قتل ہوتے ہی سب کچھ ختم بھی ہو گیا اور اس شورش کو کچل دیا گیا۔ صاحب الزنج کی شورش کچل تو دی گئی لیکن اس کی بنیاد پر عراق سے بحرین کی علیحدگی کے خواہاں دیگر لوگوں کی ہمت بندھی اور انہوں نے بحرین میں حکومت کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا چنانچہ صاحب الزنج کی شورش کے ایک دہائی کے بعد ابوسعید جنابی کی سربراہی میں قرامطہ نے سر اٹھایا اور انہوں نے دیکھتے ہی دیکھتے بحرین پر نہ صرف قبضہ جما لیا بلکہ مدتوں تک کے لئے بحرین کو مرکز خلافت سے دور کر دیا ابوسعید نے قطیف، ہجر اور احسا پر قبضہ کرنے کے بعد احسا کو اپنا مرکز بنایا (مقریزی اتعاظ الحفاء ،۱/۶۲)

اور دھیرے دھیرے وہاں پر تعمیراتی کام شروع کیا وہاں زراعت اور کھیتی باڑی کو خوب رونق بخشی اور اپنی حکومت کے پایوں کو اتنا مضبوط بنا لیا کہ بغداد کی حکومت لاکھ کوششوں کے بعد بھی ابوسعید کا کچھ نہ بگاڑ سکی ابوسعید کے ۳۰۱ھ ہجری میں انتقال کے بعد اس کے جانشین ابوطاہر نے یکے بعد دیگرے اپنی دہشت کا وہ طبل بجایا کہ جس کی نظیر کم ہی نظر آتی ہے۔ چنانچہ بحرین کے قدیم تمدن اور درخشاں ماضی کے باوجود اسے ایک ایسے بدترین واقعہ کے لیئے بھی جانا جاتا ہے جس میں قدرت وطاقت کے نشہ میں چور ابوطاہر نے اسلامی تاریخ کا بدترین واقعہ بھی رقم کیا اور ۸/ذی الحجہ ۳۱۷ھ مطابق ۹۳۰ء میں کعبہ پر حملہ کر کے زم زم کے کنویں کو مسلمانوں کی لاشوں سے پاٹ دیا اور قتل وغارت گری کا وہ بازار گرم کیا کہ واقعہ حرہ سے لگے زخم مسلمانوں کے ذہنوں میں پھر ہرے ہو گئے صرف قتل و غارت پر ہی اکتفا نہ کی گئی بلکہ حجر اسود کو کعبہ کی دیوار سے اکھاڑ کر بحرین میں اپنے پایتخت ''الاحساء'' منتقل کر دیا گی۔ (ابوعلی مسکویہ، تجارب الامم ۵/۲۷۹) ابوطاہر سلیمان نے حجر اسود کے اردگرد ایک مسجد بھی بنوائی کہ لوگ حج کے لئے مکہ مکرمہ نہ جاسکیں تقریبا ۲۵ سال تک حجر اسود بحرین میں رہا اور پھر ایک دن کوفہ کی مسجد سے اسے برامد کیا گیا جس کے پاس یہ تحریر پڑی ہوئی تھی کہ ہم نے حاکم کے حکم پر عمل کرتے ہوئے اسے نکالا تھا اب اسی کے فرمان پر یہاں چھوڑ رہے ہیں۔ (رشید الدین طبیب، جامع التواریخ ،ص ۱۷/) جبکہ اس سے قبل حجر اسود کو دوبارہ اپنی جگہ پر لانے کے لئے عبید اللہ مہدی نے ابوطاہر سلیمان کو خط بھی لکھا تھا اور اس عمل کی مذمت کرتے ہوئے جلد از جلد اسے اپنی جگہ واپس رکھنے کا مطالبہ کیا تھا۔ اس کے علاوہ اس کو واپس اپنی جگہ رکھنے کے عوض کئی ہزار دینار کی پیشکش بھی کی گئی تھی لیکن اس وقت ابوطاہر سلیمان نے اسے ٹھکرا دیا تھا لیکن بعد میں خود ہی بغیر کچھ لئے واپس بھی کر دیا (

ابن اثیر، الکامل فی التاریخ جلد۶، ص ر۲۳۵) کہا جاتا ہے کہ کچھ لوگوں نے جب یہ دیکھا کہ حجراسود کا بحرین منتقل کرنا ان کے لئے بالکل فائدہ مند نہیں ہوا بلکہ اس سے ان کی ساکھ کو نقصان ہی پہنچا ہے تو خاموشی کے ساتھ مسجد کوفہ میں لا کر ڈال دیا۔

ابو طاہر کے انتقال کے بعد بحرین کے حالات عباسیوں کے حق میں ہو گئے، اور حسن اعصم کے دور میں قرامطوں کا مرکزی خلافت کی طرف رجحان اپنے عروج پر پہنچ گیا۔ اس دور میں قرامطہ اس قدر عباسیوں سے قریب ہوئے کہ انھوں نے ۳۶۰ھ مطابق ۹۷۱ء میں عباسیوں کے مطیع ہونے کی حیثیت سے شام پر چڑھائی کر دی اور سیاہ لباس پہنے حسن اعصم نے مصر پر بھی لشکر کشی کی، لیکن حسن اعصم کی موت کے بعد قرامطیوں کی حکومت کمزور ہوتی چلی گئی اور ابو بہلول کی حکومت میں مقامی عربوں کو کافی قدرت حاصل ہوئی۔ قرامطہ لاکھ کوششوں کے باوجود بحرین کو ابو بہلول کے تسلط سے نہ چھڑا سکے۔ کچھ ہی عرصہ بعد ابو بہلول کے فرزند زکریا نے اپنے باپ کو قتل کر کے حکومت پر قبضہ جما لیا لیکن ابھی زکریا کی حکومت کو کچھ دن ہی ہوئے تھے کہ اس کی بساط حکومت کو بنی عبدالقیس کے ایک شیعہ عبداللہ بن علی عیونی نے سمیٹ دیا، اس کے بعد عبداللہ عیونی نے احساء میں بچے کھچے قرامطیوں سے بھی نجات پانے کے لئے ملکشاہ سلجوقی سے مدد مانگی چنانچہ جزیرۃ العرب پر ایک بار پھر لشکر کشی ہوئی اور اطراف واکناف میں بچے کچے قرامطیوں کا بھی صفایا ہو گیا اور اس طرح قرامطیوں کے بعد پانچویں صدی ہجری کی دوسری دہائی میں بحرین میں شیعی حکومت کی داغ بیل پڑی جو ۱۷۰ سال سے زیادہ عرصہ تک قائم رہی۔ (دائرۃ المعارف بزرگ اسلامی، زیر نظر کاظم موسوی بجنوردی رجلد۱۱،، حرف ب ذیل بحرین

بحرین سقوط قرامطہ سے صفوی دور تک:

پانچویں صدی کے اواخر میں عبداللہ کے انتقال کے بعد بحرین کی باگ ڈور عبداللہ کے بیٹے فضل بن عبداللہ نے سنبھالی۔ عیونی خاندان کے پاس جب تک حکومت رہی اسے نشیب و فراز کا سامنا رہا حتی بسا اوقات ایسے مسائل بھی سامنے آئے جو عیونی خاندان کے افراد کے مابین لڑائی جھگڑے کا سبب بنے۔ بہر صورت خاندانی معرکہ آرائی کے باوجود بحرین پر یہی خاندان حکومت کرتا رہا، عیونی حکومت ''عصافیر'' بھی کہا جاتا ہے۔ (بحرین، مباحث کشور ھا و ساز مانھائے بین المللی ر ص ۱۳۶) عیونی حکومت ایسے وقت میں وجود میں آئی تھی کہ اطراف کے

جزائر میں اس وقت دیگر نیم مستقل حکومتیں بھی وجود میں آچکی تھیں اور اسی بنا پر ایک دوسرے کے علاقوں میں تاخت وتاز کی بنیاد پر اس علاقے میں جنگ کے شعلے بھڑکتے رہتے تھے جیسا کہ ۵۴۹ھ اور اس کے بعد کئی بار جزیرہ کیش کے حاکم نے یہاں پر حملہ کیا۔ بحرین کے اطراف میں قائم ہونے والی نیم مستقل حکومتوں کی ایک دوسرے کے علاقہ میں دراندازی اور عیونی خاندان میں آپسی چپقلش کے چلتے جب عیونی خاندان کی پکڑ کمزور ہوگئی تو محمد بن احمد بن فضل عیونی نے ناصر عباسی سے دوستانہ تعلقات بڑھائے اور ان تعلقات کے ذریعہ عیونیوں کے نیم جاں پیکر میں ایک تازہ روح پڑ گئی۔ عیونی حکومت کے استحکام کا دور زیادہ دن نہ رہ سکا بلکہ محمد بن احمد کے قتل ہوتے ہی پھر سے اختلافات کا بازار گرم ہوگیا۔ ایک طرف تو عیونی خاندان کا آپسی نزاع حکومت کے پایوں کو متزلزل کر رہا تھا تو دوسری طرف کیش کا حاکم بحرین کو اپنی قلمرو میں داخل کرنے کے پر تول رہا تھا اس لئے اس دور میں بحرین اور بھی آشفتہ حالی کا شکار رہا۔ اس آشفتہ حالی کے چلتے یہ دور بھی بحرین کے باشندوں کو دیکھنا پڑا کہ وہ کیش کے حاکموں کو خراج دینے پر مجبور ہوگئے (دائرۃ المعارف بزرگ اسلامی، زیر نظر کاظم موسوی بجنوردی جلد ۱۱ ص ۴۰۶)

چنانچہ ابو سعد زنگی نے خلیج فارس پر لشکر کشی کی اور انجام کار ۶۳۶ھ میں محمد بن ابی ماجد کی سربراہی میں آخری سانسیں لیتی ہوئی عیونی حکومت کا قصہ بھی تمام کر دیا اور بحرین کو اس کے دیگر متعلقہ علاقوں کے ساتھ فارس سے ملحق کر دیا ۶۷۱ھ میں رکن الدین محمود قلہاتی نے بحرین کی آشفتہ سامانی کو دیکھتے ہوئے یہ چاہا کہ اس پر حملہ کر کے اسے اپنے قبضہ میں لے لے لیکن امیر سوغونجاق نے رکن الدین کو پسپا کر دیا اور بحرین فارس کا ہی ایک حصہ رہا ۶۹۲ھ میں مغل ''ایلخان'' نے خلیج فارس اور اس کے بحرین جیسے جزیروں کو ''جمال الدین ابراہیم بن محمد طیبی'' معروف بہ ''ملک اسلام'' کے حوالے کر دیا البتہ اس کے بعد ہرمزیوں کے حاکم قطب الدین تہمتن نے بحرین پر حملہ کر کے اسے اپنے اختیار میں لے لیا اور پھر اس کے بیٹے تورانشاہ کے دور تک بحرین کے حالات ناساز رہے، لیکن حالات کی سنگینی کے باوجود بحرین پر ہرمزیوں ہی کی حکومت تھی (دائرۃ المعارف بزرگ اسلامی، زیر نظر کاظم موسوی بجنوردی جلد ۱۱ ص ۴۰۶،) یہاں تک کہ ایران کے تخت حکومت پر شاہ اسماعیل صفوی نے قدم رکھے دسویں صدی کے آغاز تک ''اجود بن زامل جبری'' ہرمزیوں کی جانب سے بحرین پر حکومت کر رہا تھا۔ قبیلہ بنی جبر کے سرداروں نے جب یہ دیکھا کہ ہمارا اپنا ہی آدمی بحرین کا حاکم ہے اور ہرمزیوں کے حکام ضعف وسستی میں مبتلا ہیں تو

اس نے اپنی قلمرو کو خلیج فارس کے جنوبی ساحلوں تک بڑھا دیا جب ہرمز کے حکام نے قبیلہ بنی جبر کی یہ قدرت طلبی دیکھی تو وہ پریشان ہوئے لہذا انہوں نے خواجہ عطا کی سپہ سالاری میں ۹۱۳ھ میں بحرین پر چڑھائی کر دی جس کے نتیجہ میں قبیلہ بنی جبر کو مجبوراً ہرمزیوں کی حکومت کو قبول کرنا پڑی لیکن پرتگال کی بحرین پر چڑھائی کے بعد بنی جبر کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا اور حکومت کی باگ ڈور شرف الدین فالی کے ہاتھوں میں سونپ دی گئی۔ شرف الدین فالی اور اس کے خاندان نے سیاسی اور تجارتی میدانوں میں بڑی کامیابیاں حاصل کیں یہ لوگ شیعہ مذہب کے پیرو تھے اور بحرین میں شیعی حکومت کی تجدید حیات میں ان کا بڑا ہاتھ مانا جاتا ہے۔ فالی خاندان کے سرداروں نے ۹۲۸ھ سے ۱۰۱۰ھ مطابق ۱۵۲۲ء سے ۱۶۰۱ء تک بحرین پر حکومت کی۔ (دائرۃ المعارف بزرگ اسلامی، زیر نظر کاظم موسوی بجنوردی جلد ۱۱ ص ۴۰۶) ۹۲۷ھ مطابق ۱۵۲۱ء میں حاکم بحرین نے پرتگالیوں کے خلاف نقارہ جنگ بجادیا جس کے نتیجہ میں پرتگالیوں کے دارالتجارۃ کے سردار کوسولی پر چڑھا دیا گیا اس کا اثر عیسائیوں پر بھی پڑا اور کچھ کو اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑے دھیرے دھیرے قیام دیگر علاقوں کی طرف پھیلتا چلا گیا اس قیام کو ہرمز کے امیر توران شاہ کی حمایت حاصل تھی جب گوا میں مقیم پرتگالیوں کے نائب السلطنہ کو قیام کی خبر ملی تو اس نے ایک برالشکر قیام کو کچلنے کے لئے روانہ کیا جس کے نتیجہ میں ہرمز مشینری کے آپسی اختلافات کو اپنے حق میں استعمال کرتے ہوئے پرتگالیوں نے قیام کو کچل دیا توران شاہ کو جب اطلاع ملی تو اس نے جزیرہ قشم میں پناہ لی لیکن قبیلہ بنی جبر کے ایک سردار کے ہتھے چڑھ گیا اور مارا گیا۔ ادھر عثمانی حکومت نے مصر اور دریائے سرخ تک قدم بڑھا دیئے تھے بین النہرین کے جنوبی علاقوں میں سلطنت عثمانیہ کا وجود پرتگالیوں کی تشویش کا باعث تھا۔ پرتگالیوں اور حکومت عثمانی کے مابین تعلقات اچھے نہ تھے لہذا بحرین کے سابقہ حاکم نے عثمانیوں سے خط و کتابت شروع کی تا کہ انہیں پرتگالیوں کے ممکنہ خطرات سے آگاہ کر سکے اور پھر ان کی حمایت کے سایہ میں شرف الدین فالی نے پرتگالیوں کے خلاف جنگ چھیڑ دی اس بار پھر گوا میں مقیم پرتگالیوں کے نائب السلطنہ نے شورش کو کچلنے کے لئے اپنے بھائی کو روانہ کیا لیکن پرتگالیوں کو بری طرح مات کھانی پڑی اور نائب السلطنہ کے بھائی کو بھی اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑا۔ (دائرۃ المعارف بزرگ اسلامی، زیر نظر کاظم موسوی بجنوردی جلد ۱۱ ص حرف ب/ذیل بحرین) سترہویں صدی میں بحرین کی حکومت میں اس قدر داخلی اختلافات ہوئے کہ ایران کی صفوی حکومت بحرین کے مسئلہ کی سنگینی کو دیکھتے ہوئے اس طرف اور

بھی متوجہ ہوگئی جب صفوی حکومت نے دیکھا کہ خاندان فال کے درمیان رسہ کشی بڑھتی جارہی ہے تو صفوی حکومت نے ہر طرح سے اسے ختم کرنے کی کوشش کی لیکن کوئی خاص کامیابی حاصل نہ ہوسکی اور آپس میں کئی جھڑپیں ہوئیں اور قتل و غارت گری کا بازار گرم رہا یہاں تک کے بحرین تین ماہ کے محاصرہ کے بعد دوبارہ ایران کی مرکزی حکومت کے زیر نگیں قرار پایا۔ امام قلی خان کے قتل کے بعد جب ''سوندوک سلطان زنگنہ'' حکومت بحرین پر براجمان ہوا تو اپنی وفاداری کے اظہار کے لئے صفوی شہنشاہ کے حضور میں اس طرح پہنچا کہ اس نے امیر تیمور گورکان کی تلوار کو شاہ ایران کی خدمت میں پیش کیا۔ (دائرۃ المعارف بزرگ اسلامی، زیر نظر کاظم موسوی بجنوردی جلد ۱۱ ص ۴۰۶، دانشنامہ جہان اسلام زیر نظر دکتر غلام علی حداد عادل حرف ب/ذیل بحرین) سلطان زنگنہ کے بعد حکومت باباخان کے حوالے کی گئی لیکن باباخان نے لوگوں پر اس قدر سختی کی کہ ۱۰۷۷ھ میں اسے معزول کر دیا گیا اور اس کی جگہ ''سلطان قزل خان'' کو حکومت پر منصوب کیا گیا، شاہ سلطان حسین صفوی کی حکومت کے آخری دور میں ایران بھی حملوں کی زد سے محفوظ نہ رہ سکا اور عمان کے سلطان نے ایران کی سرحدوں کا رخ کیا، یہاں تک کے عمان کے حاکم نے بحرین پر بھی ہاتھ ڈال دیا۔ بحرین کے حاکم ''مہراب سلطان'' نے عمانیوں کے حملوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور انہیں پیچھے کھدیڑ دیا۔ (دائرۃ المعارف بزرگ اسلامی، زیر نظر کاظم موسوی بجنوردی جلد ۱۱ حرف ب/ذیل بحرین)

۱۱۲۹ھ میں ایک بار پھر سلطان بن سیف نے قطر کی پشت پناہی میں بحرین پر حملہ کر دیا یہ وہ دور تھا جب شاہ ایران نے ایک فاش غلطی کی اور عین حملے کے دوران بحرین میں اپنے حاکم کو معزول کر دیا جس کے نتیجہ میں عمانیوں نے بحرین پر قبضہ کر لیا۔ بحرین کے عمانیوں کے ہاتھوں میں چلے جانے کے بعد فارس کے والی ''لطف علی خان'' نے بہت کوشش کی کہ ہالینڈیوں اور پرتگالیوں کی مدد سے بحرین کو واپس لیا جاسکے لیکن کوئی کامیابی نصیب نہ ہوسکی پھر بھی لطف علی نے ہمت نہ ہاری اور بحرین کو واپس لینے کی ایسی ٹھانی کہ واپس اپنی قلمرو میں کر کے ہی دم لیا لیکن اس بار پرتگالیوں اور ہالینڈیوں سے مدد کی گہار نہ لگا کر علاقائی لوگوں کو بحرین پر حملہ کے لئے تیار کیا اور آخر کار ۱۱۳۰ھ میں بحرین کو دوبارہ فتح کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ (دائرۃ المعارف بزرگ اسلامی، زیر نظر کاظم موسوی بجنوردی جلد ۱۱ حرف ب/ذیل بحرین) بحرین کی یہ فتح افغانیوں کے اصفہان پر حملے اور صفوی خاندان کے زوال سے قریب تھی اور اسی کے بعد صفوی خاندان کی حکومت تمام ہوگئی تھی... (جاری ہے)

منابع و ماخذ:

۱ـ ابن بطوطه، سفرنامه ابن بطوطه، ترجمه محمد علی موحد، تهران/۱۳۶۱

۲ـ ابن اثیر الکامل فی التاریخ، بیروت ۱۴۰۵/۱۹۸۵ء

۳ـ ابن حوقل؛ صورة الارض؛ بیروت لبنان؛ منشورات دار مکتبه الحیاة، ۱۹۷۹، لیدن

۴ـ ابن حزم، علی، جمهرة انساب العرب

۵ـ ابن هشام، سیره ابن هشام

۶ـ ابوعلی مسکویه، تجارب الامم

۷ـ بلاذری، احمد بن یحیٰی، فتوح البلدان، تهران نشر نقره

۸ـ محمد بن جریر طبری، تاریخ طبری

۹ـ یاقوت حموی، معجم البلدان

۱۰ـ دکتر حسین قرچانلو، جغرافیای تاریخی کشورهای اسلامی

۱۱ـ غلام رضا گلی زواره، جغرافیای جهان اسلام، آشنائی با کشورهای اسلامی و قلمرو اقلیتهای مسلمان

۱۲ـ دانشنامه جهان اسلام حرف ر/ب، زیر نگرانی غلام علی حداد عادل

۱۳ـ دائرة المعارف بزرگ اسلامی جلد ۱۱، زیر نگرانی کاظم موسوی بجنوردی

۱۴ـ دکتر شامی، یحیی، موسوعة المدن العربیه والاسلامیه، بیروت، دار اللفکر العربی

۱۵ـ دائرة المعارف تشیع، زیر نظر احمد صدر حاج سید جوادی

۱۶ـ محمد سعید بهمن پور، اسماعیلیه از گزشته تا حال

۱۷ـ مهدی فرمانیان، درسنامه تاریخ و عقائد اسماعیلیه

۱۸ـ میخائیل یان، قرمطیان بحرین و فاطمیان

۱۹ـ ـ بحرین مباحث کشورها و سازمانهای بین المللی

Fuller,Graham,E, & Rend rahim francke The arab shia;the forgeotten muslims.20

6ـ;chapte

ایک کتاب: خلاصہ وتبصرہ

کتاب ''جمہوریت کا انجام'' تعارف وتبصرہ اور مختصر تنقیدی جائزہ

مرتضی شیرودی
ترجمہ: سید نجیب الحسن زیدی
کتاب کا نام: جمہوریت کا انجام
مصنف: جان میری گنو
صفحات: ۱۵۰

مقدمہ:

پیش نظر تحریر، جان میری گیانو {Jean Marie Guehenno} کی ایک سو پچاس صفحات پر مشتمل تصنیف ''جمہوریت کا انجام'' {La fine de la democratic} کے خلاصہ اور تنقیدی جائزہ پر مشتمل ہے۔اس کتاب کا، پرنٹ ہو کر آنے کے کچھ ہی دن میں مغرب کے روشن فکر محافل میں جم کر استقبال ہوا، مغربی دانشور طبقے میں اس کی پذیرائی کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ گیانو کے عقیدہ کے پیش نظر جمہوریت ہر انسانی سماج کے کمال کی انتہا وحد نہیں ہے جس کے چلتے تمام معاشرے یہ چاہیں کہ جیسے بھی ہو جمہوریت کے ہم نوا بن جائیں اور کسی بھی قیمت پر اسے حاصل کر

کے دم لیں اس لئے کہ آج جمہوریت تمام شمالی ممالک (پہلی دنیا= مغرب) اور جنوبی ممالک (تیسری دنیا= مشرق) میں بڑی رکاوٹوں سے دوچار ہے جن میں سے کچھ یہ ہیں:

سیاست سے گریز پا سماج:

ہم حکومتوں کے اختتامی دور کی دہلیز پر کھڑے ہیں، جسے اختتام عصر حکومت کہا جا سکتا ہے، یہ حکومتوں کا اختتامی دور اپنے باطن میں فریب و نیرنگ کے بل پر چلنے والی سیاست کے دور کے تمام ہو جانے کے مفہوم کو لئے ہوئے ہے، دوسرے الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ آج سیاست سے گریز کا سرچشمہ یہ ہے کہ موجودہ جمہوریتوں میں سیاست ایک بدنام سی بدطینت شے ہے مثلاً امریکہ کی سرکاری مشینری میں تیس ہزار ایجنٹوں کی لابی پائی جاتی ہے، تیس ہزار افراد پر مشتمل ایجنٹوں کی لابی کا وجود بخوبی اس بات کو واضح کر رہا ہے کہ مارڈن دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت میں کوئی بھی فیصلہ لینے کے مراحل کس قدر عمیق و پیچیدہ ہونے کے ساتھ الجھے ہوئے ہیں، اس لئے کہ ان ایجنٹوں کی لابی مثلاً اپنے مافوق افسروں کے لئے کچھ ایسی معلومات فراہم کرنے کا کام کرتی ہے جسکی روشنی میں کمپنیاں و کارخانے اپنے مفادات کا غیر قانونی ہونے کے باوجود دفاع کر سکتے ہیں وہ بھی صرف اس بنیاد پر کہ انہیں ان کی لابیوں نے ایسی اہم معلومات فراہم کی ہیں کہ جنہیں وہ ٹرسٹ اور ملٹی نیشنل کمپنیوں کی ورکنگ کمیٹی کے حوالے کر سکتے ہیں۔

یہ بالکل واضح ہے کہ یہ لابیاں بغیر اجرت و مفاد کے کام نہیں کرتی ہیں، بلکہ جو بھی فائدہ ہو اس میں ان کا بھی کچھ حصہ ہوتا ہے اور زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کرنے کی خواہش انہیں سرمایہ داروں کے مفادات کے دفاع کی طرف اور بھی کھینچتی ہے اسی بنیاد پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ امریکہ میں صرف ثروت مند افراد کے مفادات کا خیال رکھا جاتا ہے اور انہیں کے حقوق کا دفاع ہوتا ہے چنانچہ اب یہ تعجب کی بات نہیں ہے کہ ان ایجنٹوں کی لابی میں یہ کہا جاتا ہے کہ جو کچھ جنرل موٹر کے حق میں بہتر ہے وہی امریکہ کے حق میں بھی بہتر ہے۔

اس بات کا یہ مطلب ہے کہ اب سیاست کا رزلٹ عمومی مفادات کا تحفظ نہیں ہے بلکہ سیاست کے معنی خصوصی مالکین کے مفادات کے حصول کی راہوں کو تلاش کرنا اور ان کے مسائل کا حل کرنا ہے یعنی ٹریڈ یونین اور سیاست ایک دوسرے کے لئے کام کرتے ہیں مفادات کے یونین اور خصوصی مالکین کے لئے مخصوص ہو جانے کی منطق اس کے بے شمار ذیلی شعبوں اور برانچوں کے وجود میں آنے کا سبب بنے گی اب یہ ایک فطری بات ہوگی کہ ہر ایک اپنے ذاتی مفادات کو زیادہ سے زیادہ حاصل کرنے کے لئے جو بن پڑے انجام دے گا۔ ہر وہ طریقہ کار استعمال میں لائے گا جس سے زیادہ سے زیادہ اس کو فائدہ ہو سکے، یعنی یہ وہ دنیا ہے کہ جس کی قوت محرکہ یہ نہیں ہے کہ مشترک مفادات کو قانونی درجہ دیا جائے اور انہیں تسلیم کیا جائے بلکہ یہاں پر سب کی لڑائی سب سے ہوگی بالفاظ دیگر باہمی گتھم گتھی کا سماں ہوگا، ایک ایسی گتھم گتھی و باہمی لڑائی جس میں ایک انسان کی طاقت کی سرحد اپنے ہی ہمسایہ کی طاقت کی سرحد ہوگی ایسی ہولناک فضا کا ماحصل ایک ایسی دنیا کی صورت میں سامنے آئے گا جس کی تعریف انسانی اصولوں کے دائرہ میں ممکن نہ ہوگی بلکہ اس فضا میں ایک دوسرے سے الگ پہچان ان مشکلات کے ذریعہ ہوگی جنہیں صرف ذاتی مفادات کے حصول کے شیووں ہی کے ذریعہ حل کیا جا سکتا ہے؛

ان تمام باتوں کے پیش نظر اب ایک سیاستداں کا فریضہ یہ بنتا ہے کہ یونین اور خصوصی مالکین کے مسائل کو ادارہ کرے اس صورت میں سیاستداں پہلے مرحلہ میں ایک بشارت دینے والا شخص ہے لیکن یہاں پر مشکل یہ ہے کہ اس کے پاس جو ذرائع و وسائل ہیں ان سے کچھ ہونے والا نہیں ہے اس لئے کہ وہ ناامیدی کے سوا کسی کو کچھ نہیں دے سکتے، دوسری بات یہاں پر یہ ہے کہ سیاستداں رپوٹروں اور میڈیا کی شراکت میں معاشرے کے شعور کو غلط راستہ پر ڈال کر ادارہ کرتا ہے تیسری بات یہ ہے کہ یہاں پر اس طرح کی یقین دہانی ہوتی ہے کہ سیاستداں جس چیز کے بارے میں بول رہا ہے صرف وہی درست ہے اور جو کچھ وہ کہہ رہا ہے سب کچھ اپنی جگہ صحیح ہے اس لئے کہ اسکا فیصلہ اور اس کی تدبیر ہی درست ہے۔ چوتھی بات یہ ہے کہ جو معرفت عمیق اور گہرے ہونے کی شایستگی رکھتی ہے وہ علامتوں کی شناخت ہے نہ حقیقتوں کا کشف کرنا یعنی معرفت و شناخت کا کل مفہوم یہ ہے کہ وہ ان دستورات اور

اصولوں کی پردہ کشائی کرتی ہے جوفردی،خصوصی اور گروہی ترقی کا باعث ہوں نہ یہ کہ وہ قومی،عمومی اور مجموعی طور پر ترقی کے اصولوں کی نقاب کشائی کریں۔

اس سیاست کا نتیجہ ایسے سماج کی صورت میں سامنے آئے گا جہاں نہ کوئی شہری ہے اور نہ ہی اسکا کوئی ذاتی تشخص ہماری اس گفتگو کے پیش نظر یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ امریکہ ایک برتر جمہوریت کے آئیڈیل کی صورت میں سیاسی انسداد کا شکار ہے،اس لئے کہ معاشرہ کا پارہ پارہ ہو جانا اور خصوصی مالکیت کے مفادات کی ہوڑ اس بات کی سبب بنی ہے کہ ایسے متعدد محاذ اور گروہ وجود میں آئیں جو اپنا اپنا راگ الاپ رہے ہیں،اور یہ اس وجہ سے ہے کہ چھوٹے چھوٹے فیصلوں کی ایک زنجیر ایک چھوٹے سے گروہ نے اپنے چھوٹے چھوٹے اہداف تک پہنچنے کے لئے بنالی ہے جسکے حلقے ایک دوسرے کے مختصر دائرہ میں اپنے مفادات کے تحفظ میں پیوست ہیں اس درمیان عمومی مفادات کو نظر انداز کر دیا گیا ہے جسکے نتیجہ میں یہ تعجب کی بات نہ ہوگی کہ ترقی یافتہ جمہوریتوں میں رائے دہندگان الیکشن میں کم سے کم حصہ لیں اور سیاستدانوں کی ساکھ روز بروز اپنے وطن میں کمزور ہوتی جائے۔

اجتماعی دراڑیں اور فاصلے :

جمہوریت ایک عالمی امپائر تشکیل دینا چاہتی ہے،لیکن اس کام کے لئے اسے ایک ایسی بڑی طاقت میسر نہیں جس کے سایہ میں جمہوریت کو عالمی کیا جا سکے،اس لئے کہ جمہوریت کا کوئی ایک نظری اور عملی مفہوم نہیں ہے، مثال کے طور پر امریکی جمہوریت اور یورپین جمہوریت میں بہت فرق پایا جاتا ہے،مثلا ایک فرق یہ ہے کہ یورپی جمہوریت ایک دوسرے کو جوڑے رہنے اور مل کر آگے بڑھنے کے عنصر پر زور دیتی ہے لیکن امریکی جمہوریت کا زیادہ زور آزادی پر ہے شاید یہی سبب ہے کہ ہر فرانسسی ، جرمنی اور برطانوی کی یہ آرزو ہے ک کہ ایربس ، بوئنگ سے زیادہ کامیاب رہے،البتہ خود یورپی لوگوں کے درمیان کافی تضاد دیکھنے میں آتا ہے مثال کے طور پر فرانس کے باشندوں کی یہ عادت ہے کہ وہ قومی مفادات پر سوال اٹھاتے ہیں،لیکن جرمنی اپنے بارے میں بدگمانی کا شکار رہتے ہیں اور انکا ردعمل کچھ اور ہوتا ہے یعنی بدگمان رہنے کی وجہ سے فرانس کے باشندوں سے مختلف رہتا ہے۔

مفادات کا یہ تضاد اور جمہوریت کے بارہ میں انسجام وانصرام کا نہ ہونا اپنے اپنے ملکوں کے باشندوں کی پریشانی کا سبب بنتا ہے حتی قومی سطح پر امریکہ میں بھی یہ تضاد وآشفتہ حالی کی کیفیت نظر آتی ہے لہذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ واشنگٹن جب ٹکزاس، کیلیفورنیا، اور نیویارک کے باشندوں کے متضاد مفادات کو ایک دوسرے سے نہیں جوڑ سکتا تو آخر سوئڈن، پولینڈ، اٹلی، فرانس اور پرتگال کے لوگوں کے مفادات کو اپنے مفادات کے ساتھ کیسے جوڑ سکتا ہے۔

اس بات سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ نہ امریکہ اور نہ یورپ کوئی بھی عالمی طاقت میں تبدیل نہیں ہوسکیں گے، لہذا بہتر یہی ہوگا کہ عالمی سطح پر ایک دوسرے سے جڑے ہوئے چینلوں یا چند قطبی دنیا کی بات کی جائے۔ اس لئے کہ جس طرح موجودہ دور کی صورت حال سامنے آرہی ہے اس کے مطابق جمہوریت عالمی سیاست کے ایک پیکر کو وجود بخشنے میں ناکارآمد ہے بلکہ جو کچھ رونما ہو رہا ہے وہ ایک ایسے سلے ہوئے کپڑے کی صورت ہے جس کی سلائی آشکار وواضح نہ ہو، یہ سلائی جو بھی ہو لیکن اس سے عالمی جمہوریت کی ایک بڑی طاقت ابھر کر سامنے آنے والی نہیں ہے، جس کا نتیجہ ایک ایسی فضا کا وجود میں آنا ہے جس سے جڑے ہوئے ہر ایک ملک کے سیاسی ڈھانچہ کی جڑیں مقامی اور علاقائی اعتبار سے کافی گہرائی میں پیوست ہوں اور اسی بنیاد پر سیاسی نظام کی ہر یونٹ اپنے عالمی رول کو ادا کرسکتی ہے اور بقدر کافی دیگر ممالک اور دیگر سیاسی یونٹوں سے متصل رہ کر اپنے وجودی نقص کو کم کرسکتی ہے۔

یہاں پر اس بات کا تذکرہ ضروری ہے کہ اپنے رول کی ادائیگی کے لئے اس بات سے آگاہ وباخبر ہونا ضروری ہے کہ اہرامی شکل کا وہ سلسلۂ مراتب ڈیموکریسی جس کی عالمی سطح پر توسیع کے درپے ہے درحقیقت اب ختم ہوتا جارہا ہے اور نابودی کے کگار پر ہے اور اس کی جگہ قدرت کا ایک درخت نمونہ کے طور پر وجود میں آرہا ہے، اہرامی شکل کے سلسلہ مراتب کا ڈھانچے میں قدرت وطاقت کا مطلب کنٹرول کرنا اور حکم دینا ہے اب یہ سلسلہ مراتب اپنی جگہ ایک ایسے ڈھانچہ کو دے رہا ہے جس میں طاقت کئی ایک دوسرے سے متصل حلقوں میں تقسیم ہو رہی ہے اس سیاسی ڈھانچہ میں قدرت وطاقت کا مفہوم ایک دوسرے سے جڑے رہنا اور دیگر سیاسی یونٹوں سے تعلق بنائے رکھنا ہے یہ ایسا ڈھانچہ ہے جس میں قدرت وطاقت کا تعین اثر رسوخ ونفوذ کی شرح کے ساتھ گھٹتا بڑھتا ہے

اس میں اس ملک یا اس ملک پر لگام نہیں کسی جاتی۔

قدرت و طاقت کے درختی تصور میں ایک ایسی سیال دنیا کا وجود سامنے آتا ہے کہ جس کا ثبات مختلف شعبوں اور تنظیمیوں کی بنیادوں پر نہیں ہے بلکہ اس کا ثبات تبدیلیوں پر استوار ہے، اس لئے کہ یہ ایک ایسی دنیا ہے جس میں زیادہ لچک پائی جاتی ہے اور یہ زیادہ باثبات ہے ایک ایسی دنیا جسے حیاتیات {.Biology} کے پروگرام کے مطابق تعمیر کرنا ہوگا فزکس کے قوانین کے مطابق نہیں یہ وہ دنیا ہے جسے ڈیموکراسی کے ان اصولوں سے ماوراء ہوکر بنانا ہوگا جن کی کوشش یہ ہے کہ واحد اور غیر لچک دار دستور کے مطابق ایک دو سے ہم آہنگ نظام کو دنیا میں پھیلا دیا جائے۔

ناکارآمد فیصلوں طریقہ کار یا مرحلہ وار عمل:

فکر و اندیشہ ڈیموکریسی کو آزادی سے جوڑتا ہے، لیکن آزادی کے معنی اگر اپنی سرنوشت کے انتخاب، یا طاقت کو لگام دینے کے معنی ہیں تو یہ اب اپنے زوال کے دور سے گزر رہا ہے طاقت کے نفاذ پر کنٹرول کا دور اب ختم ہوگیا ہے اور اس کے ساتھ پوری عالمی جمہوریت کی کشش کا رنگ بھی اب پھیکا پڑ گیا ہے، درحقیقت کچھ لوگوں کے ارادوں کو دوسروں کے سر تھوپنا اقلیت کی آزادی کے لئے ایک خطرہ ہے۔

اس ڈیموکریسی کے کھیل کے اصول وضوابط ہی ڈیموکریسی کو نافذ کرنے کے معیار معین کرتے ہیں اس میں کوئی حساب کتاب نہیں ہے اور سیاسی فیصلوں پر بھی کوئی جانچ پڑتال نہیں ہے، جس کا نتیجہ یوں سامنے آیا ہے کہ ڈیموکریسی کے اس کھیل میں من مانی کرنے پر کوئی روک ٹوک نہیں ہے چنانچہ اجتماعی بھید بھاؤ اور چپقلشوں میں اضافہ ہوا ہے، جبکہ جاپان کا سیاسی اور اجتماعی نظام امریکہ کے دیموکریسی کے کھوکھلے دعووں سے بہتر طور پر عمل کر رہا ہے، اس لئے کہ اس میں کسی بھی سیاسی فیصلہ سے قبل مختلف میٹنگیں ہوتی ہیں ان میٹنگوں میں تمام نظریات کو سامنے آنے کا موقع ملتا ہے اور بغیر کسی ڈر اور خوف کے مختلف نظریات پیش کیے جاتے ہیں کسی ایک نتیجہ تک پہنچنے کے لئے جلسوں اور میٹنگوں کی تعداد کا زیادہ ہونا ہرگز فرضی نہیں ہے بلکہ گفتگو کے اختتام پر بیان کیے گئے نظریات کو صیقل کیا

جاتا ہے جس سے بہتر نظریات نمایاں ہوجاتے ہیں، آخری فیصلہ تمام چھوٹے چھوٹے فیصلوں کو ملا کر کیا جاتا ہے، ان میٹنگوں کا ایک فائدہ یہ ہے کہ تمام وہ لوگ جو ان میٹنگوں میں حاضر ہوتے ہیں وہ اپنے فیصلوں کی آنے والی ذمہ داریوں میں شریک ہوجاتے ہیں اور اس طرح انہیں پتہ چلتا ہے کہ انکا فیصلہ صحیح تھا یا غلط چنانچہ اگر صحیح نہ ہو تو پھر اس کی اصلاح کرتے ہیں۔

جاپان اس لحاظ سے بالکل امریکہ کے مقابل کھڑا نظر آتا ہے، اس لئے کہ امریکی منطق سب پر یہ حکم نافذ کرتی ہے کہ اپنے تمام امکانات و وسائل کا استفادہ اس جنگ میں کامیابی کے لئے کیا جائے جس میں حق و ناحق کا فیصلہ اجتماعی قراردادوں کا قانون کرتا ہے، لیکن جاپان کی منطق اعتدال و احتیاط کی تاکید کرتی ہے، فیصلہ لینے کے اس طریقہ کار میں نہ کوئی مرکز ہے نہ کوئی بڑی طاقت، بلکہ یہاں ایسے بہت سے گروہ نظر آئیں گے جن کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ اپنے ساتھی گروہ کی طاقت کو نقصان پہچائے بغیر فیصلہ لے سکیں اور اس کے نفاذ کی شرح میں اضافہ کرسکیں یہاں پر دونوں گروہ جب فیصلہ کی گھڑی آتی ہے تو دو طرفہ طور پر اپنے اپنے دائرہ میں رہ کر اپنی بات کو پیش کرنے کے بنیادی اصولوں کے پابند ہیں لہذا اس صورت میں کوئی اور ایسی طاقت کا وجود ہی نہیں ہوتا جو ان کی تابع ہو بلکہ جو کچھ ہوتا ہے وہ ایسی طاقت کی شکل میں ہے جو تقسیم ہوچکی ہے یا یوں کہا جائے ذروں ذروں میں بکھرنے کے بجائے پھیل گئی ہے اور اسی وجہ سے آپسی ستیز و جنگ کو اس نے بے اثر بنادیا ہے اس کے برخلاف امریکی فیصلوں کے چینل میں اگر کوئی بڑی طاقت کہیں سر اٹھاتی ہے تو اسے فی الفور کچل دیا جاتا ہے یا اس مرکز کو تتر بتر کردیا جاتا ہے۔

سلسلہ مراتب کا ڈھانچہ:

جمہوریت میں ایک سلسلہ مراتب کا وجود پایا جاتا ہے نیز یہاں پر ایک ایسے مشینی ماڈل کو پیش کیا جاتا ہے جس میں ہم نوائی اور ایک جیسا ہونا ایک اصول ہے یہاں پر بھید بھاوء، رسومات کو توڑنا اور طاقت سیاسی قدرت کے اہرام میں سے ایک ہے اس کا تعلق اجتماعی ڈھانچہ سے نہیں ہے یہ ماڈل نہ تو شاہوں سے متعلق ہے نہ فلسفیوں، ثروت مندوں اور دانشوروں سے بلکہ اس میں ایک ہی سطح کے ایک جیسے ہم نوا لوگوں کی ضرورت ہے، البتہ یہ ایک حقیقت ہے کہ

صنعتی اور ترقی یافتہ معاشروں میں ایک جیسا اور ایک سطح پر ہونا نہ کوئی الگ سے ایک اتفاق ہے اور نہ کمزوری یا لائق افسوس شئے، بلکہ یہ مغربی ڈیموکریسی کے مطلوبہ لیبرل نظام کی ایک شرط ہے، اور اس کے معنی تمام حاکم اور مسلط طبقے کی سطح کی اس طرح یکجائی ہے کہ صرف وہی ہے جو اپنے افکار اور سوچ کے زاویوں کو سماج کے حوالے کر رہا ہے اسی کی فکر سماج میں رائج ہے اور اسی پر عمل ہو رہا ہے چنانچہ جب ہم سری اور ہم نوائی کو اس رخ سے دیکھتے ہیں تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ایسے ہم نوا معاشروں میں ہم نوائی کے مخالفوں کو بدمعاشوں اور نظم عامہ کو تباہ کرنے والوں کا نام دے کر الگ تھلگ کر دیا جاتا ہے۔

ہم نوائی کے اس مرحلہ میں تمام جگہوں پر ایک ہمنوائی دیکھنے میں آتی ہے کھانے پینے کی اشیاء فروخت کرنے والوں سے لیکر خیاطی ولباس سلنے کا کام کرنے والوں تک سب کے سب یہ چاہتے ہیں کہ خلاقیت کو وجود بخشے بغیر ایک ایجادی خلاقیت کو پیش کریں۔ درحقیقت اس مقام پر کسی کارخانے یا کمپنی کی سب سے گراں قدر پونجی صنعت اور اس کے مصنوعات میں منحصر نہیں ہے بلکہ ایک مارک کی حیثیت رکھتی ہے اور صرف نام کا سکہ چلتا ہے یہاں پر یہی اہم ہے کہ وہ اپنا نام وسکہ جمانے میں کامیابی سے ہم کنار ہو چنانچہ عصر ڈیموکریسی یا جمہوریت کو ایک دوسرے کو ٹوپی پہنانے والے دور کا نام بھی دیا جاسکتا ہے جہاں واقعی خلاق افراد کو انکے مقام کے اعتبار سے احترام حاصل نہیں ہوتا ہے، بلکہ سماج ایک ایسی صورت میں ڈھل جاتا ہے جہاں طاقت ہر روز پہلے سے زیادہ ایک نقطہ میں سمٹتی چلی جاتی ہے، کوئی بھی بے نام ونشان انسان اپنے عمل اور ایکشن کو دیگر افراد کے عمل سے یکساں نہیں پاتا ہے، یہاں اطلاعات اور اسالیب کو تھوپا جاتا ہے، آپسی فاصلے اور وہ کثرت کار جو ہدف تک پہنچنے میں اٹھنے والے قدموں کی رفتار کو کند کر دے یہاں اچھی طرح نظر آتی ہے، ہر ایک فیصلہ اپنی جگہ ایک فیصلہ ہوتا ہے ان کا دوسرے فیصلوں سے کوئی تعلق نہیں ہوتا ہے صرف بعض فیصلوں ہی کی سماج میں پبلسٹی ہوتی ہے۔

ہم نوائی اور اتفاق کی فرانس ایک جیتی جاگتی مثال ہے، ۱۹۴۰ء میں فرانسیوں نے یہ باور کر لیا تھا کہ انہوں نے جرمنیوں کے مقابل ڈٹ کر مقابلہ کیا ہے نہ یہ انہیں شکست ہوئی ہے، اسی طرح فرانس نے ۱۹۶۶ء میں نیٹو کی

مشترکہ افواج سے نکل کر اپنے استقلال کو امریکہ کے سامنے بھی محفوظ رکھا، اس اطمینان بخش یکسوئی نے انہیں زندگی کی گاڑی آگے بڑھانے میں مدد کی اور ان کی خود اعتمادی کو مضبوط کیا لیکن اگر غور کیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ یہ چیز ایک ماہرانہ منظر سازی کے علاوہ کچھ نہ تھی، اس لئے کہ فرانس کے بارے میں اس طرح کا تصور درحقیقت ہمیں ۱۹۴۰ء کے جرمنی، ۱۹۶۶ء کے امریکہ اور ۱۹۹۳ء کے جرمنی ۲۰۰۴ کے امریکہ کو اس طرح دیکھنے میں مانع ہے جس طرح وہ اس زمانے میں تھے۔

یہ قلبی باور و یقین صحیح طور پر معاملہ کو سمجھنے میں ایک رکاوٹ ہے، ہم نوائی کا دلدادہ ہونا درحقیقت ایک ایسے لباس کی طرح ہے جو بار ہا پہننے کی بنا پر جسم ہی کے قالب میں ڈھل جاتا ہے اور اسکا بیرونی وجود وہی بن جاتا ہے جو جسم کا ہوتا ہے اس طرح یہ لباس اپنی لچک کو کھو دیتا ہے، اس بات کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ جمہوریت اور ڈیموکریسی ایک ایسا نظام ہے جس کے اندر انعطاف و لچک تقریبا نہ کے برابر ہے۔

ادیان سے جنگ:

مغربی انسان کے دل میں دین و مذہب کا رجحان بالکل ناپید ہے، بظاہر دو صدی پہلے مونٹسکو کی یہ پیشین گوئی درست ثابت ہو رہی ہے جس میں کہا گیا تھا کہ جدیدت کے دور میں پیدا ہونے والی ہلچل اور اتھل پتھل دین کی موت پر منتہی ہوگی، آج ایسا ہی کچھ ہے، آج مغربی انسان کی نظر میں اپنی روزمرہ کے حوادث سے جھوجھتی زندگی کو با معنی بنانے کے لئے سحر آمیز تعلقات اور ماورائی رجحانات سے جوڑنے کے سوا دین کے کوئی معنی نہیں ہیں۔

سیاست نے مغربی انسان سے دینی سرچشمہ کو چھین لیا ہے جس کے نتیجہ میں آج وہ دین سے دوری کے درد میں پیچ و تاب کھا رہا ہے اور اسے سکون میسر نہیں ہے ایسی صورت حال میں اسلامی جمہوریہ ایران کے انقلاب کے بعد جو رجعت پسندی کی لہر مغرب میں دوڑی ہے اس کا ہم و غم یہ ہے کہ آپس کے معاشرتی اور فردی تعلقات کو گرمی بخشنے کے ساتھ باہمی اجتماع کے ذریعہ دین کو دوبارہ منظر نامے پر واپس پلٹایا جائے، لیکن مسئلہ یہ ہے کہ

رجعت پسند وقدامت پرست افراد جس عدالت کے اصولوں پر مبنی سماج کو تعمیر کرنا چاہتے ہیں وہ کبھی بھی اوپر سے اور معاشرے کی اوپری سطح پر کسی شاہزادے کے بیٹھ جانے سے میسر نہ ہوگا بلکہ ایسے سماج کی تعمیر نچلے اور دبے کچلے طبقوں سے اس وقت ممکن ہو سکے گی جب مستضعفین کو پاور حاصل ہو، یہ معقول بلند پروازی صرف دین وسیاست کے باہمی ربط کے ٹوٹنے پر مبنی ہوتی ہے، مغرب کی ثروت مند جمہوریتوں میں دین کی طرف رجحان کچھ مختلف انداز میں ظاہر ہوتا ہے لیکن ہر جگہ دین سیاست سے مایوسی کے ساتھ روبرو ہے۔

سیاست میں پھنسے ہوئے لوگوں کی رہائی سے ناامید ہوکر کچھ لوگوں نے انسان دوستانہ سرگرمیوں کو تنہائی سے نکلنے کا بہترین ذریعہ جانا، اور انسان دوستانہ سرگرمیوں میں مشغول ہوگئے، انسان دوستانہ سرگرمیاں اس بات کی غماز ہیں کہ سیاسی تنظیمیں واقعی اتحاد وہم دلی کو وجود لانے میں نہ صرف یہ کہ ناکام ہیں بلکہ ان سے کسی باہمی اتفاق و یک دلی کی امید ہی بے کار ہے۔

یہ انسان دوستانہ فعالیتیں انسانی کے تنہائی سے فرار کرنے کا ایک ذریعہ ہیں، دوسرے الفاظ میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ ایک ڈیموکریٹک انسان کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ تنہائی ہے ایسے انسان کی تنہائی ایسی ہی ہے جیسے کوئی اکیلا انسان، لوگوں کی بھیڑ میں گم ہوگیا ہو وہ انسان جو قافلہ سے الگ تھلگ ہوگیا ہو اور کسی سے اسکا کوئی تعلق بھی نہیں ہے اور وہ آج کی مغربی بکھری ہوئی دنیا میں بالکل اکیلا ہے ایسی دنیا کہ جہاں نہ کوئی سیاسی پیوستگی وہم آہنگی ہے اور نہ ہی فلسفی ودینی نظم وانضباط، یوں اکیلے پن میں سایوں کی طرح پریڈ پر نکل پڑا ہے اب مغربی انسان کے لئے کوئی ایسی ذمہ داری نہیں ہے جسے وہ ادا کرے اس کے پاس سبزوں کی ڈنٹھل کے سامنے خم ہوکر ان کی عبادت کرنے اور چاند کی روشنی کے سامنے خضوع کے ساتھ سر جھکانے اور زور گزر ہیجانات کے آگے تسلیم ہونے کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔

انقلاب ''کوپرنیکی'' اس طرح کی حالت کو واضح کرنے کی ایک بہترین مثال ہے اس لئے کہ انقلاب ''کوپرنیکی'' نے زمین کو اس کے مرکزی جائے وقوع سے نکال کر مرکزی حیثیت سورج کو عطا کی اور اسے زمین کی جگہ

مرکزی حیثیت کا حامل جانا، یعنی اس نے ایک مرکز کے وجود کی ضرورت کے نظریہ کو اپنے عمل سے پائدار و محفوظ بنا دیا، ایک مرکز کا وجود در حقیقت وہی نظریہ ہے جس پر اب مردنی چھائی ہوئی ہے یہ حقیقت میں دین کا تصور ہے اس لئے آج دین سے تہی دست مغرب کا انسان دین کی طرف بھاگتا نظر آ رہا ہے وہ دین جواب پہلے کی طرح کچھ رسوم و آداب کے مجموعہ کا نام نہیں ہے بلکہ فرانس کے عظیم دانشور ایکس ڈوٹکیل {Alexis-Charles-Henri Clérel de Tocqueville} کے بقول دین ایسے دستورات کے مجموعہ کا نام ہے جو انسان کی معاشرتی رفتار کو ڈھالتا ہے اور اجتماعی طرز حیات کو وجود بخشتا ہے، پس اب دین کے معنی صرف ایک عالی اور ماورائی مفہوم پر کسی فرد کا اعتقاد نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق اجتماعی اور معاشرتی زندگی سے بھی ہے۔

مالی فساد و کرپشن:

جمہوریت و دیموکریسی میں جو طاقت ہے وہ صرف ایک مجازی طاقت نہیں ہے بلکہ ایسی طاقت ہے جو پیسہ کے بل پر اپنا اظہار کرتی ہے جہاں معاملہ پیسہ کا ہو تو جمہوریت کا حال یہ ہوتا ہے کہ عمومی مال کو خصوصی اور انفرادی سے تمیز نہیں دی جاتی شاید یہی وجہ ہے کہ رشوت کا لین دین اور مالی فساد و کرپشن مغربی انسان کے لئے پریشانی کا باعث نہیں ہے اور جب یورپ کے قدیم ممالک جیسے جرمنی و فرانس میں مالی کرپشن سامنے آتا ہے تو لفافے میں رکھ کر بس یہی جواب دیا جاتا ہے کہ یہ انسانی کی طبیعت کا تقاضا ہے اور طمع و حرص اس کی ذات میں پائی جاتی ہے کبھی بھی اس کرپشن کو صنعتی سماج کی خصوصیات سے جوڑ کر نہیں دیکھا جاتا ہے البتہ مغربی ممالک میں فساد و کرپشن سے مقابلہ کا تصور پایا جاتا ہے لیکن مالی فساد سے مقابلہ کی راہوں کے عملی ہونے کے سلسلہ میں قطعی فیصلہ لینے والی مشینری کا موجودہ ڈھانچہ اپنے پیچیدہ طریقہ کار کی وجہ سے کرپشن کے خلاف عملی قدم اٹھانا کافی دشوار کر دیتا ہے اس لئے کہ کسی ایک فیصلہ تک پہنچے میں بہت سے لوگ دخیل ہوتے ہیں جس کے نتیجہ میں فساد سے مقابلہ کے سلسلہ میں بنائے گئے قانون کا بروقت نفاذ ممکن نہیں رہتا اور اسی بنیاد پر مالی فساد و کرپشن میں ملوث لوگوں کی طاقت میں اضافہ کے ساتھ قانون کے چنگل سے بچ نکلنے کا امکان بڑھ جاتا ہے۔

مغرب کے لیبرل ڈیموکریسی کے نظام میں مالی اور دفتری فساد کے انواع واقسام نظر آتے ہیں مثال کے طور پر ایک کلرک کی طاقت کا انحصار اس کے علم وتجربہ پر نہ ہو کر دوسرے سے اس کے تعلقات پر ہوتا ہے اور انہیں تعلقات کی بنا پر فساد میں اضافہ ہوتا ہے ان تعلقات ومراسم کے علاوہ بڑے درجہ کے افسروں کو ان کے رٹائرمنٹ کے بعد بھی پرایئوٹ کمپنیوں میں اچھی اور کافی تنخواہوں پر کام دلا دینے کا وعدہ بھی فساد کا سبب ہے؛ چنانچہ فرانس جیسے ملک میں بھی جہاں عمومی خدمات پیش کرنے اور لوگوں کی خدمت کرنے کی ضرورت کا نظریہ دیگر ممالک سے زیادہ بادوام رہا ہے، حکومت کے اعلی مناصب نے اپنے جاذبہ وکشش اور اجتماعی مرتبہ کو کھو دیا ہے جس کی وجہ سے نوکر پیشہ افراد کبھی کبھی اس صورت حال سے آگاہی کے بعد مالی فساد کو ایک وسیلہ کے طور پر سامنے رکھتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ مالی فساد کا رونا رو کر اپنی خدمات کے مقابل منھ مانگے دام حاصل کریں اور طرف مقابل کو اپنے شرائط پر تسلیم کرلیں۔

جو بھی ہو عمومی کاموں اور مشاغل کا انحطاط کا سرچشمہ عمومی وسرکاری اور خصوصی کمپنیوں کے مابین نادرست روابط ہیں، لہذا یہ کوئی تعجب کا مقام نہیں ہے کہ قوم کے نابغہ افراد اپنے کام کا آغاز حکومتی مشینری سے کرتے ہیں اور انجام کار خصوصی و پرایئوٹ جگہوں پر اپنے کام کو ختم کرتے ہیں جس کا نتیجہ حکومت کی اہمیت کا کم ہونا ہے جب کہ حکومت کا احترام اسی وقت ہے جب وہ پرائیوٹ محکموں اور غیر سرکاری کمپنیوں کی طرح اسکیم تیار کرے اور ان کی طرح آگے بڑھے۔

اگر حکومت پرایئوٹ اور غیر سرکاری اداروں کی روش پر کام کرنا چاہے تو اپنے اس عمل میں شاید مختلف ماہرین اور اپنے کام کے سلسلہ میں جانے پہچانے چہروں سے کسی وزارت کی پوسٹ پر تعاون اور مدد کی درخواست ممکن ہے پرایئوٹ کمپنیوں کے ہم سطح حکومتی مناصب کو نہ پہچا سکے لیکن عام لوگوں کے درمیان حکومت کی حیثیت کو بہتر بنانے میں مددگار ثابت ہوسکتی ہے: لیکن مغربی مارڈن حکومتیں اس اقتدار کو کھونے کے بعد جو عمومی مفادات کے سلسلہ میں امانت داری پر منتہی ہوتا تھا اس وقت پہلے سے زیادہ اس سوءظن کا شکار ہیں کہ یہ حکومتیں مالی فساد کو صرف

اسی لئے محکوم کرتی ہیں کہ اس محکومیت کے ذریعہ ہڑپی گئی ثروت ودولت کو اپنے پاس محفوظ کرسکیں؛ اس وضاحت کی روشنی میں اب بڑی بڑی جمہوریتوں میں مالی دھاندلی بازی رائج ہے اور دستور وآداب کے خلاف کوئی برا عمل نہیں ہے بلکہ کامیابی کے واحد معیار کے طور پر پیسہ کامیابی وفتح کا ایک منطقی نتیجہ ہے، اور دوسروں کی بہ نسبت زیادہ سے زیادہ طاقت وثروت حاصل کرنے کے لئے واحد وسیلہ ہے جس کے بل پر راتوں رات سونے کے رتھ پر سوار ہوا جاسکتا ہے

شدت پسندی: {Rudeness}

گزشتہ پچاس برسوں میں ایٹمی مقابلہ آرائی عصر جمہوریت میں شدت پسندی {Rudeness} کا سب سے بڑا نمونہ ہے دوسرے الفاظ میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ آخری دہائیوں میں انسانوں کے قتل عام سے یہ پتہ چلتا ہے کہ جمہوریت اور ڈیموکریسی کے نام پر لبوں پر مسکراہٹ سجا کر، آمریت اور استبداد سے زیادہ قتل عام کیا جاسکتا ہے، یہ بات لائق توجہ ہے کہ آج کل جمہوریت کی اس جنگ میں جوان سرزمینوں سے ہے جہاں جمہوریت کا فقدان ہے صرف لشکر اور فوج کو شکست دینا کافی نہیں ہے بلکہ اس جنگ میں قوم کی طاقت کی بنیادوں کو نابود کردینا بھی جنگ جیتنے کے لئے ضروری ہے۔

اس مقام پر جمہوری نظام کے اندر ایٹمی مزاحمت درحقیقت انسانوں کو اسیر کرنے یا ان کے قتل عام کا آخری مرحلہ ہے؛ اس لئے کہ اس میں ایسی طاقت کے استعمال کا اختیار ایسے جمہوری اصولوں پر کوئی عقیدہ نہ رکھنے والے ایک فرد کے ہاتھ میں ہے جس کے استعمال یا عدم استعمال پر تمام لوگوں کی زندگی وموت کا دارومدار ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک قوم کی موت وحیات کا اختیار بظاہر ایک ڈیموکریٹ کے ہاتھوں میں دے دینا مزاحمت کے مقابل تمام انسانوں کو لاکر کھڑا کردینا ہے کیونکہ مزاحمت کی صورت میں تمام انسان یکساں ہوں گے اور جہاں تک ایٹمی حملہ کے اثرات ہوں گے وہاں تک سبھی لوگ اس مزاحمت کے دائرہ میں آئیں گے لہذا مزاحمت کے مقابل تمام انسانوں کا یکساں ہونا غلاموں کی آپسی برابری سے مشابہ ہے جس میں سب کے سب غلام ہیں انسان رنگ و

نسل قوم وقبیلہ کے اعتبار سے مختلف ہیں لیکن غلامی کے لحاظ سے سب غلام ہیں اسی طرح جب مزاحمت ہوگی تو انسان جتنے بھی مختلف کیوں نہ ہوں حملہ کے اثرات سب پر ہوں گے، اگر جمہوری اصولوں کے مطابق بھی دیکھا جائے تو جو لوگ اس طرح کی صورت حال کو تسلیم کرنے پر راضی ہیں اور وہ شخص جو لوگوں کے دفاع کی ذمہ داری اٹھائے ہوئے ہے دونوں ہی جمہوری اصولوں کے خلاف ہیں۔

اس موضوع کو دوسرے زاویہ نظر سے بھی دیکھا جا سکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ کیا یہ صحیح ہے کہ ایک مغربی انسان ان اقدار سے چشم پوشی کر لے جن کے بموجب دنیا میں جمہوریت کے اصولوں کی بالادستی کی بات ہوتی ہے اور جمہوریت کے نظریہ کو ساری دنیا میں پھیلانے کی بات ہوتی ہے نیز جمہوری اقدار و نظریہ کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اس نظریہ کو وجود بخشے یا تقویت دے کہ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ عام اور غیر فوجی لوگوں کو نہ صرف یہ کہ اس نظر سے نہ دیکھا جائے کہ یہ عام لوگ ہیں بلکہ انہیں اس رخ سے دیکھا جائے کہ یہ وہ لوگ ہیں جنہیں بس نابود ہو جانا چاہیے؛ اگر ایسا ہی ہے تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ دور شدت پسندی{Rudeness} کا ایک ہولناک دور ہے یہی وجہ ہے کہ آج کا انسان اس دور کو ڈھونڈ رہا ہے جہاں نہ صرف یہ کہ شدت عمل اور سختی و درشتی نہ ہو بلکہ سختی اس طرح ہو کہ اس میں افراط نہ پایا جاتا ہو اور عدم افراط کے ساتھ کسی شخص، سرکار، اور پلیس کی شدت پسندانہ سخت کارروائیوں کو انفرادی شدت پسندی سے جدا کیا جا سکے۔

ان کارروائیوں کا ایک دوسرے سے متمائز اور آپس میں جدا ہونا اس لئے ہے کہ آج کی دنیا میں مجرمانہ عمل اور جنگ میں تمیز نہیں دی جا سکتی ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ حکومت کے محکمہ میں مجرموں کا اثر و رسوخ فیصلہ کن حد تک رہتا ہے اور اسی بنیاد پر مسافر بردار طیارے کو مار گرایا جاتا ہے، امن و سلامتی کو ذاتی اغراض و مقاصد کا بازیچہ بنا دیا جاتا ہے پلوٹونیم{Plutoniumþ} کو چراتے ہیں البتہ دولت کی ریل پیل ان پتھر دلوں کو ان کی سفاکی میں اور بھی نڈر بنا دیتی ہے۔ حالت یہ ہو جاتی ہے کہ حتی یہ لوگ فقیر طبقے کو سالم غذائی مواد نہ ملنے کی وجہ سے اپنی موت بھی نہیں مرنے دیتے بلکہ ان ادھ موئے لوگوں کو مشین گن سے بھون دیتے ہیں، درحقیقت جمہوریت فقیر نشین

علاقوں میں شدت پسندانہ کاروائیوں کو ختم یا محدود کر کے صحت وسلامتی کا ربن باندھ کر حیات نو بخشنے میں ناکام رہی ہے، اس لئے کہ مبادلہ کاری کے جہانی ہونے، تنظیموں کی تحریکوں کے وجود میں آنے، اور عام تباہی پھیلانے والے اسلحوں کے وجود اور اگر ایک جملہ میں کہا جائے تو ڈیموکریسی کی ناتوانی ہی شدت پسندانہ کاروائیوں کے ختم نہ ہونے کا سبب ہے اور ڈیموکریسی کے ناکارآمد ہونے ہی کی بنیاد پر شدت پسندانہ کاروائیوں کے خلاف ہونے والے اقدامات شکست سے دوچار ہوتے ہیں۔

بیہودگی و ناکارآمدی کا دور :

بیہودہ مصرف:

عصر جمہوریت میں انسان کو نہ صرف آزادی سے بلکہ ہر طرح آزادی فکر سے محروم کر دیتے ہیں؛ چنانچہ ۱۹۹۱ء میں ہونے والی عراق سے جنگ کے دوران امریکی ڈیموکریسی کا ایک بڑا اہم وغم داخلی رائے عامہ {Public opinion} کو دھوکا دینا تھا؛ اسی وجہ سے تاریخ جنگ میں پہلی بار ایسا ہوا کہ ویتنام کی جنگ سے سبق لیتے ہوئے امریکی فوجی کمانڈروں نے رائے عامہ کی جہت دہی کو اتنی ہی اہمیت دی جتنی وہ جنگ کے لائحہ عمل کو اہمیت دیتے تھے، دوسرے الفاظ میں اس جنگ کو ماہر افراد کے ذریعہ عظیم و برتر ٹکنالوجی کے حامل کی شکل میں امریکہ نے اس طرح ہنڈل کیا جس طرح فوجی ڈسپلن کو قائم رکھنے کے لئے آپریشن ہوتے ہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ آخر حقیقت میں امریکہ کب تک اپنی ٹکنالوجی کو محفوظ رکھ سکے گا؟ نتیجہ کے طور پر اگر اس موضوع کو ایک دوسرے زاویہ سے دیکھیں تو ہمیں نظر آئے گا کہ مغربی سیاسی نظام کا حاصل یہ ہے کہ وہ کہتا ہے آزادی ہونا چاہیے لیکن ڈیموکریسی کا وہ قائل نہیں ہے اس کے پاس آزادی کا جواب ''ہاں'' میں ہے اور ڈیموکریسی کا ''نہ'' اور یہ درحقیقت ڈیموکریسی کا بیہودہ مصرف کے طور پر شان وشوکت کے ساتھ پیش کیا جانا ہے یہ بالکل وہی چیز ہے جسے جان میری گیانو نے ترقی یافتہ استبداد کا نام دیا ہے، اس توصیف کے ساتھ ڈیموکریسی، تاریخ کے اختتام کی مدعی ہے؛ لیکن اب دنیا میں تاریخی حقیقتوں کو تلاش نہیں کیا جاسکتا کیونکہ یہاں تاریخی حقائق کا سامنا کرنے کی تاب نہیں ہے۔

شاید یہی وجہ ہے کہ جان میری گیانو یہ مانتے ہیں کہ: مغربی لوگ یا بالفاظ دیگر ماڈرنیزم کی طرف کوچ کرنے والے بغیر کسی وقفہ کے اس راستہ پر چلتے چلتے اب تھک چکے ہیں جس نے چند صدیوں قبل ترقی و پیشرفت کی فکر کو ان کے سر پہ سوار کر دیا تھا، لیکن اب ان کی یہ آرزو ہے کہ کچھ دیر وہ ٹھہر کر آرام کر لیں اور ترقی کے اس بوجھ کو زمین پر دھر کر خود چھٹکارا پا جائیں جسے وہ ایک کبھی نہ ختم ہونے والی دیوانہ وار دوڑ کے مقابلہ میں اپنے ساتھ اٹھائے بھاگے چلے جا رہے ہیں، ان کے سامنے ایک ایسا انقلاب ہے جسے انہیں انجام تک پہنچانا ہے یہ انقلاب، انقلاب سیاست نہیں بلکہ معنویت کا انقلاب ہے اس لئے کہ گزشتہ چند صدیوں میں ترقی و توسیع کا عمل بے نظیر رہا ہے، کمپنیاں بڑی ہوگئی ہیں سنڈیکیٹ {Syndicate} اور کیمبرج میں توسیع ہوئی ہے ...لیکن یہ تمام چیزیں ریت کے ڈھیر پر بنی ہوئی عمارتوں کے مثل ہیں؛ لہذا اب یہ کہنا ضروری ہے کہ ڈیموکریسی کو خطرہ لاحق ہے اور اس کی نجات کے لئے دوراہوں میں سے کسی ایک راہ کو منتخب کرنا ہوگا اول یہ کہ نابودی کے سرچشمہ کی طرف پلٹ جائیں اور چند جہان شمولی کے اصولوں پر باہمی اتفاق کے ذریعہ فطری حقوق کی ان نئی بنیادوں کی جستجو کا عمل شروع کیا جائے کہ جس کے بغیر حقوق کا کوئی مطلب نہیں ہے دوسرا راستہ یہ ہے کہ حقیقت کے روبرو ہوا جائے یعنی روشن گری کے اس دور کے انجام سے سبق حاصل کیا جائے اور پھر یہ کوشش کی جائے کہ جن چیزوں کو بچایا جا سکتا ہے انہیں بچایا جائے۔

نتیجہ:

مشرقی بلاک کے ٹوٹ جانے کے بعد ۱۹۱۷ء میں جس جدید دور کا آغاز (کمیونسٹی انقلاب) اور کچھ لوگوں کے بقول ۱۹۴۵ء (دوسری عالمی جنگ کے اختتام پر) ہوا تھا وہ ابھی ختم نہیں ہوا ہے بلکہ جو دور ختم ہو رہا ہے وہ حکومتوں کا دور ہے؛ چنانچہ آج دنیا قوموں کے منظر سیاست و حاکمیت پر ابھر کر سامنے آنے کا مشاہدہ کر رہی ہے، اس کا مطلب تاریخ کا اختتام نہیں ہے بلکہ اس کے معنی تو تاریخ کے جدید دور کے آغاز کے ہیں۔ یہ دور قوموں کی حکومت کا دور ہے قوموں کے امپائر کا نظریہ ایسی دنیا کو ہمارے سامنے لاتا ہے جو بغیر کسی مرکز کے متحد ہے.

جان میری گیانو کے عقیدے کے مطابق یہ وہی دور ہے جسکا وعدہ جناب دانیال نبی نے کیا تھا: ''اس کے بعد چوتھی

سلطنت کا قیام ہوگا جو فولاد کی مانند مضبوط ہوگی، اور اپنے سے ٹکرانے والی ہر چیز کو توڑ کر ریزہ ریزہ کر دے گی (کتاب مقدس، دانیال نبی، باب دوم،) وہ قوم جس کی سلطنت کا جان میری گیانو نے وعدہ دیا ہے اس سے مراد قدیمی مفہوم نہیں ہے بلکہ قوم کا جدید مفہوم ہے جس کے بعض خصوصیات یہ ہیں:

اول: جدید قوم میں سرزمین کا عنصر کسی قوم کے قوام وثبات کی بنیاد نہیں ہے یعنی اس میں کسی سرزمین کو اپنے قبضہ قدرت میں رکھنا اہم نہیں ہے۔

دوم: جدید قوم آج کل کی جمہوریتوں کے برخلاف ٹیکس و لگان کی وصولی اور اسے مینج کرنے میں اہم رول ادا کرتی ہے۔

سوم: کل آنے والی قوم اس بات سے باخبر ہوگی کہ کوئی بھی قوم دا ہے وہ امریکی قوم کے برابر کیوں نہ ہو، باعزت زندگی گزارنے کے لئے ضروری سرچشموں اور ذخائر کو اپنے لئے فراہم نہیں کر سکتی ہے۔

چہارم: کل کی آنے والی قوم صلح طلب اور امن پسند ہے لہذا دفاعی امور کے لئے کم بجٹ مخصوص کرے گی اور اس کی کوشش تعمیر وآبادکاری پر زیادہ ہوگی۔

پنجم: کل کی آنے والی قوم یہ جانتی ہوگی کہ وہ چاہے جتنی بھی طاقت ور ہو جائے عالمی ثبات کو برقرار نہیں کر سکتی؛ جبکہ آج کی مغربی ڈیموکریسی کی نظر میں زمین قوم کے قوام کا بنیادی عنصر ہے؛ ٹیکس ولگان کا حصول حکومت کے ہاتھ میں ہے انسانی حیات کے لیئے ضروری ذخائر ومنابع کو حکومت پورا کرتی ہے۔

حکومتیں اپنے بجٹ کا زیادہ تر حصہ دفاعی امور پر صرف کرتی ہیں، اور ڈیموکریسی کے سایہ میں زندگی گزارنے والی قومیں مغربی اقوام کی طرح خود کو عالمی امن وثبات قائم کرنے کی توانائی کا حامل سمجھتی ہیں؛ لیکن آج اس طرح کے سیاسی نظان کی ناکارآمدی بالکل واضح ہوگئی ہے اور یہ امر اس بات کی نوید دیتا ہے کہ جمہوریت کا دور اب ختم ہوا چاہتا ہے اس لئے کہ بجائے اس کے کہ اسے رائے عامہ کا خیال ہو یہ حکومت کا خیال رکھتی ہے عوام سالار ہونے کے بجائے یہ حکومت سالار ہے۔

تنقیدی جائزہ:

جمہوریت کے موجودہ بحرانوں کی ایک مغربی دانشور (جان میری گیانو) کی جانب سے بیان کی گئی توصیف قابل توجہ ہے؛ لیکن یہ توصیف یا تنقید قبل اس کے کہ مغربی ڈیموکریسی کے نظام کی نظریاتی بنیادوں کو مدنظر رکھے، مغربی معاشروں خاص کر امریکہ میں اس کے عملی نتائج کو بیان کر رہی ہے جبکہ علمی تنقید وتبصرہ میں سب سے پہلے نظریاتی بنیادوں پر تنقید ہوتی ہے اس کے بعد عملی نتائج کی موشگافی کرتے ہوئے ان کا تجزیہ کیا جاتا ہے تاکہ پہلے نظریاتی بنیادوں پر مشتمل اس کے نقائص کو واضح اور برملا کر دیا جائے اس کے بعد عملی پہلو پر نظر ڈالی جائے اور نظریاتی موشگافی کے بعد عملی تجزیہ کو پیش کرنے میں صحیح طور پر فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ کیا صحیح ہے کیا غلط؟؛ لیکن ''جان میری گیانو'' کے اس اثر میں جو چیز زیادہ توجہ کے لایق ہے وہ ان کی جانب سے پیش کی ہوئی ایسی راہ نجات ہے جسے انہوں نے جمہوریت کے موجودہ بحران سے باہر نکلنے کے طور پر پیش کیا ہے، درحقیقت جان میری ڈیموکریسی کو یکسر رد نہیں کرتے ہیں بلکہ ایک ایسے مستقبل کو ترسیم کرتے ہیں جس میں ایک ایسی جدید جمہوریت وجود میں آئے گی جس کا نام انہوں نے ماڈرن قوم یا امپریل عصر رکھا ہے

اس ڈیموکریسی کی نمایاں صفت، معنویت کی طرف بازگشت ہے ساتھ ساتھ قوموں کا سیاست وحاکمیت کی طرف پلٹنا ہے؛ لیکن یہ معنویت آسمانی والہی ادیان سے زیادہ زمینی ہے اور جدید بشری تصور کائنات سے فروغ حاصل کر رہی ہے؛ یہی وجہ ہے کہ ''جان میری گیانو'' اس مذہبی قدامت پرستی کو جو انقلاب اسلامی ایران سے سرچشمہ سے انکی نظر میں وجود میں آئی ہے موجودہ مریض ڈیموکریسی کا متبادل نہیں سمجھتے ہیں۔ اس کے علاوہ جس زمینی معنویت ''کو گیانو'' نے پیش کیا ہے کہ اس کے بل پر بشری تصور کائنات جیسے، لبرلزم کے مشکلات کو حل کرنے کی کوئی دلیل پیش نہیں کی ہے۔

مجموعی طور پر ایک طرح کا ماہرانہ تضاد ''گیانو'' کے اس تنقیدی مقالے میں نظر آتا ہے جس کی منظر کشی عالمانہ انداز سے ہٹ کر سیاست مدارانہ انداز میں کی گئی ہے لیکن یہی چیز ان چاہے انداز میں فرانس کے دانشور اور روشن فکر طبقے کے دینی تعلیمات سے روایتی تضاد کو بیان کر رہی ہے، اس میں شک نہیں کہ دنیا معنویت کی ضرورت کو آج محسوس کر رہی ہے لیکن وہ معنویت جو آسمانی ہے زمینی غلاظتوں اور شیطانی کثافتوں سے مبرا ہے اور انسان کو دنیا وآخرت میں منزل کمال پر پہچانے پر قادر ہے۔